اپریل تاجون ۲۰۱۳ء
جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۲
سہ ماہی
المنار
مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم　　نحمدہ و نُصلّی علیٰ رسولہ الکریم　　و علیٰ عبدہ المسیح الموعود

نگران
صفی اللہ چوہدری

مجلس ادارت
سفیر رامہ
ناصر جمیل

عِلم و عَمَل

اس شمارہ میں

مضامین

Front Cover : Recent picture of the building of T. I. College, Qadian (Now Sikh National College)

Back Cover: Railway Station, Qadian

قارئین کرام!

المنار کا دوسرا شمارہ حاضر خدمت ہے۔

مجلس طلباء قدیم امریکہ اور تعلیم الاسلام کالج المنائی کینیڈا، برطانیہ اور جرمنی کے دوستوں نے ہمارے پہلے شمارے کو سراہا۔ مجلس ان تمام احباب کی شکر گزار ہے۔

اس مجلّہ کی بہتری کے لیے ہمیں مجلس کے اراکین کی تجاویز اور تعاون درکار ہے۔ اس کے علاوہ اس مجلّہ کے باقاعدگی سے جاری رہنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس کے لئے اپنی پسند کے موضوعات پر تحریریں ہمیں بھجواتے رہیں۔ یہ دعوت تعلیم الاسلام کالج کے تمام طلباء قدیم اور اساتذہ، کہنہ مشق مصنفین یا نئے لکھنے والوں، سب کے لئے ہے۔

ہمیں آپ کی تحریروں اور آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

المنار کے لیے اپنی تحریریں ایڈیٹر کے نام بذریعہ ای میل درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:

EditorAlmanar@gmail.com

ہاتھ سے تحریر شدہ مسودہ صفحہ کے ایک جانب سیاہ روشنائی میں تحریر کریں اور اگر ممکن ہو تو scan کر کے ای میل کر دیں یا درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:

Al Manar USA
666 Gairloch Place
Bel Air, MD 21015
USA

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۵﴾

پس اللہ سچا بادشاہ بہت رفیع الشان ہے۔ پس قرآن (کے پڑھنے) میں جلدی نہ کیا کر پیشتر اس کے کہ اُس کی وحی تجھ پر مکمل کر دی جائے اور یہ کہا کر کہ اے میرے ربّ! مجھے علم میں بڑھادے۔ (طٰہٰ، ۱۱۵)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ

(ابن ماجہ)

ترجمہ: انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

علم کے لیے دُعا

حضرت مسیح موعودؑ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا: "انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعا میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ نور مانگتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی روحانی ترقی پر سیر نہیں ہوتے اس لئے ہمیشہ استغفار میں لگے رہتے ہیں کہ خدا ان کی ناقص حالت ڈھانپے اور پورا روشنی کا پیمانہ دے اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ اپنے نبی کو فرماتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا یعنی ہمیشہ علم کے لیے دُعا کر تا رہ کیونکہ جیسا خدا بے حد ہے ایسا ہی اس کا علم بھی بے حد ہے۔"

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲، ایڈیشن ۴، ص ۲۴۴)

علم کی ضرورت

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ فرماتے ہیں: " پہلا الہام جو ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفٰے ﷺ کو ہوا وہ بھی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (العلق:۲) ہی تھا اور پھر رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا کی دعا تعلیم ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علم کی کسقدر ضرورت ہے۔ سچّے علوم کا مخزن قران شریف ہے تو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قران شریف کے پڑھنے کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ حاصل ہوتا ہے تقوی اللہ سے۔۔۔"

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء)

خطبہ جلسہ تقسیم اسناد

حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیّہ

(تعلیم الاسلام کالج کی کانوکیشن ۱۹۵۰ء کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح کا تاریخی خطاب جو المنار جون ۱۹۵۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

انسانی زندگی میں مختلف تغیّرات آتے ہی رہتے ہیں اور یہی تغیّرات انسانی زندگی کی دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں۔ انسان کی زندگی سے ان تغیّرات کو خارج کر دو تو اس کی ساری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک لمبے عرصہ کی ہم آہنگی بھی بعض دفعہ انسانی فطرت کا جزو بن جاتی ہے۔ لیکن فطرت کا جزو بننے اور دلچسپی کا موجب ہونے میں بہت بڑا فرق ہے۔ فطرت کا جزو بننے کے صرف یہ معنے ہیں کہ اس شخص کو "ہم آہنگی" کوئی غیر چیز نہیں معلوم ہوتی، وہ اسے ناپسند نہیں کرتا، وہ اس کا عادی ہو گیا ہے۔ بعض دفعہ اس "ہم آہنگی" کو بدلنے سے وہ صدمہ بھی محسوس کرتا ہے مگر اس طرح جس طرح بازو کا جوڑ الگ ہو جائے تو انسان تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن جب جوڑ اپنے مقام میں صحیح طور پر جڑا ہوا ہوتا ہے تو کوئی خاص کیفیت محسوس نہیں کرتا۔ ایک انسان کی ساری عمر اگر اس طرح گزر جائے کہ اس کے بازو کا جوڑ صحیح طور پر اپنے مقام پر جڑا رہے اور کبھی اس میں کوئی تکلیف نہ ہو تو شاید ایک دفعہ بھی اسے خیال نہ گذرے گا کہ اس کے بازو کو کوئی جوڑ بھی ہے اور وہ اپنی جگہ پر صحیح طور پر جڑا ہوا ہے اور اپنے مقررہ کام کو اچھی طرح ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ ہم آہنگی سکون کو پیدا کرتی ہے۔ لیکن فکر میں ہیجان پیدا نہیں کرتی۔ پس زندگی در حقیقت تغیّرات کا نام ہے کوئی ترقی بغیر تغیّر کے نہیں۔ منزل بہ منزل آگے کو بڑھنا یعنی مختلف نیک تغیّرات کے سلسلہ میں سے گذرنا ہی ترقی کی تعریف ہے۔

خدا تعالیٰ ازلی ابدی صداقت ہے۔ ذات کے لحاظ سے وہ غیر متبدل بھی کہلاتا ہے۔ لیکن صفات کے ظہور کے لحاظ سے وہ بھی غیر متناہی تغیّرات اور تبدیلیوں کا حامل ہے۔ اگر اس کی صفات کے ظہور میں تغیّر اور تنوع نہ ہوتا تو وہ ایک منفی خدا ہوتا۔ جیسا کہ ہندوؤں اور بدھوں کا تصور ہے۔ وہ ایک مثبت خدا نہ ہوتا جیسا کہ قرآن کریم کا نظریہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

خدا تعالیٰ ہر زمانہ میں ایک نئی اور اہم حالت میں ہوتا ہے۔ پس بتاؤ تو سہی کہ تم خدا تعالیٰ کی کس نعمت کا انکار کرو گے۔ ان آیات میں نہایت وضاحت سے صفاتِ الٰہیہ کے مثبت پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانی ترقی کی ایک جامع مانع تعریف کر دی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کا زاویہ انسانوں کی طرف ہر وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ظہورِ صفات سے ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے انسان کو زاویہ بدلنا پڑے گا۔ گھوڑے کو سدھانے والا ایک چکر میں کھڑا ہو جاتا ہے اور گھوڑے کی رسی پکڑ کر خود چاروں طرف گھومتا ہے گھوڑے کو بھی اس کے ساتھ گھومنا پڑتا ہے۔ مرکزی شَے کے گھومنے کا دائرہ بہت چھوٹا بلکہ عین مرکز میں صفر کے برابر ہوتا ہے۔ مگر پہلوؤں پر کھڑے ہوئے گھوڑے کو رسّی کے برابر لمبا فاصلہ طے کر کے چاروں طرف دوڑنا پڑتا ہے اور اس میں اس کے فن میں کمال پیدا کرنے کا راز مخفی ہے۔ خدا تعالےٰ اپنا پہلو ہر وقت بدلتا ہے۔ انسان کو اس کے پہلو بدلنے کے ساتھ اپنا قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ تا خدا تعالیٰ سے ہم آہنگی قائم رہے۔ یہ تغیّر خدا تعالیٰ کے ساتھ انسانی تعلق میں تغیّر پیدا نہ ہونے دینے کے لئے ضروری ہے اور اس تغیّر سے انسان انسانیت کے فن میں کمال پیدا کرتا ہے۔ جس طرح سدھانے والے کے گرد چکّر میں دوڑ کو گھوڑا گھوڑے کی قابلیتوں میں کمال حاصل کرتا ہے اور اسی کمال کے مختلف ٹکڑے ترقی کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔

غرض آیت مذکورہ بالا میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ صفات باری تعالیٰ میں ہر وقت ایک نئی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ انسان کو بھی اپنے اندر صفات باری کے موجودہ دور کے مطابق تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ اور اس سے بنی نوع انسان کا قدم ترقی کی طرف اُٹھتا ہے۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں بنی نوع انسان کا قدم ترقی کی ایک خاص جہت کی طرف اُٹھا ہے۔ کسی وقت فلسفہ کا دور آیا ہے تو کسی وقت ادب کا۔ کسی وقت اخلاق کا دور آیا ہے تو کسی وقت فنونِ لطیفہ کا۔ کسی وقت قانون سازی کا دور آیا ہے تو کسی وقت تہور و شجاعت کا۔ غرض اچھے انسانی دماغوں

میں ہر زمانہ میں ایک ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا کی کشش ہر زمانہ کے اعلیٰ دماغوں کو اس زمانہ کے صفاتی دور کی طرف کھینچنے میں لگی رہتی ہے اور اس فن میں انسانی دماغ زیادہ ترقی کر جاتا ہے جس طرح کہ صفات باری اس وقت اشارہ کر رہی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اسے "ملاءِ اعلیٰ" کی مشاورت کا نام دیا ہے۔ یہ آسمانی فیصلے جس طرح رُوحانی امور کے متعلق ہوتے ہیں اسی طرح دنیوی علوم کے متعلق بھی ہوتے ہیں اور وہ دماغ جو اپنا زاویہ صفات باری کے موجودہ زاویہ کے عین مطابق کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اپنے زمانے کے اور اپنے فن کے راہنما بننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخ میں ایک نام پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعائے استخارہ سے اشارہ کیا ہے۔

انسان بیشک اپنی محنت کا پھل کھاتا ہے لیکن بے موسم محنت بھی تو رائیگاں جاتی ہے۔ شاید ہر غلّہ سال کے ہر حصّہ میں بویا جا سکتا ہے اور کچھ نہ کچھ روئیدگی بھی اس سے حاصل کی جا سکتی ہے لیکن وہ غلہ جو اپنے موسم میں بویا جاتا ہے اس کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ اسی طرح شاید ہر غلّہ ہر ملک میں بویا جا سکتا ہے لیکن وہ غلّہ جو اس ملک میں بویا جاتا ہے جس کی زمین کو اس غلّہ سے مناسبت ہے اس کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ ہر انسان کے لئے ہر علم کا حاصل ہونا اور ہر قسم کا کام کرنا ممکن ہے لیکن ہر فن میں اس کا صاحب کمال ہونا ضروری نہیں۔ اس کے دماغ کی مخفی قابلیتوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ مختلف مفید علوم میں سے کونسا علم اور مختلف مفید کاموں میں سے کونسا کام اس کی طاقت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اور اس کے زمانہ اور اس کے ملک اور اس کی قوم کی ضرورتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس کے لئے مناسب ہے۔ پس فرمایا کہ خواہ اچھے سے اچھا کام ہو اس کے شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر لیا کرو جس کے الفاظ آپ نے یہ تجویز فرمائے ہیں:۔

اللھم انی استخیرك بعلمك و استقدرك بقدرتك و اسئلك من فضلك العظیم فانك تقدر و لا اقدر و تعلم و لا اعلم و انت علام الغیوب۔ اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی و معاشی و عاقبة امری فاقدرہ لی و یسرہ لی ثم بارك لی فیه۔ اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر شر لی فی دینی و معاشی و عاقبة امری فاصرفه عنه و اصرفنی عنه و اقدر لی الخیر حیث کان ثم ارضنی به۔

یعنی اے میرے رب جو کام میں کرنے لگا ہوں یا جو علم میں حاصل کرنے لگا ہوں یا جو ذمہ داری میں اُٹھانے لگا ہوں اس کے بارہ میں تجھ سے جو میری مخفی طاقتوں سے بھی واقف ہے۔ اپنے زمانہ کے حال کے متعلق ارادوں سے بھی واقف ہے۔ اور میری ذاتی خاندانی قومی ملکی اور عالمگیری ضرورتوں اور ذمہ داریوں سے بھی واقف ہے سب سے بہتر فیصلہ طلب کرتا ہوں اور پھر تجھ سے یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس فیصلہ کے مطابق مجھے کام کرنے کی تجھ سے توفیق اور امداد حاصل ہو اور تیسری بات تجھ سے یہ طلب کرتا ہوں کہ جو بات میرے لئے مناسب ہو اور جس کی طرف تو میری راہنمائی کرے اور جس کے حاصل کرنے کے لئے تو میری مدد کرے۔ اس کام یا اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں تیرا انتہائی فضل مجھ پر نازل ہو۔ اور میں اس کام میں ادنیٰ مقام حاصل نہ کروں بلکہ مجھے اس میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ میں تجھ سے یونہی اور بلاوجہ یہ درخواست نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ جن امور کے پورا کرنے کی مجھے طاقت حاصل نہیں تجھے ہے۔ اور جن مخفی باتوں کا مجھے علم نہیں تجھے ہے۔ پس اے خدا اگر تیرے علم میں وہ کام جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے لئے اچھا ہے۔ میری دینی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی اور میری دنیوی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ جو طاقت اور محنت میں اس کام میں خرچ کروں گا اس کا نتیجہ مجھے زیادہ سے زیادہ اچھا حاصل ہو سکے گا تو پھر تو اس کام کے کرنے کی مجھے توفیق عطا فرما۔ اور اس کام کو اعلیٰ درجہ کی تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجھے سہولت بخش۔ اور اس کے نتائج کو میرے لئے وسیع سے وسیع تر کر۔ اور اگر اس کے برخلاف تیرے علم میں یہ ہو کہ یہ کام میرے لئے مناسب نہیں دین کے لحاظ سے یا دُنیا کے لحاظ سے یا اس لحاظ سے کہ میری محنت کے مطابق اس سے نتیجہ پیدا نہ ہو گا تو تو اس کام کے راستہ میں روکیں ڈال دے اور میرے دل میں بھی اس سے بے رغبتی پیدا کر دے اور اس کے سوا جس امر میں میرے لئے بہتری ہے اس کے سامان میرے لئے پیدا کر دے اور اس کی طرف میری توجہ پھیر دے اور اس کی خواہش میرے دل میں پیدا کر دے۔

یہ دعا کتنی کامل ہے! اور اس میں کس لطیف پیرایہ سے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہر اچھا کام ہر زمانہ اور ہر انسان کے لئے مفید نہیں ہوتا بلکہ اچھے سے اچھا کام بھی بعض زمانوں میں اچھا نہیں رہتا اور اچھے سے اچھا کام بھی بعض قوموں اور بعض افراد کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔ پس اپنی محنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ پھل حاصل کرنے کے لئے انسان کو وہ کام اختیار کرنا چاہیئے جو اس کے لئے اور اس کی قوم کے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے اس زمانہ میں مفید ہو اور جسے اعلیٰ طور پر بجا لانے کی اس میں ذاتی قابلیت موجود ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو اسے وہ کام یا علم کسی دوسرے بھائی کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے اور خود اپنے لئے اپنے مناسب حال کام یا علم تلاش کرنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ بنی نوع انسان کی ترقی کا معاملہ انسانی جدوجہد اور اس کی دماغی قابلیتوں

کے علاوہ خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کے موجود الوقت مرکز کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ اس لئے اسے کام شروع کرنے یا علم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے بھی یہ دُعا کر لینی چاہیئے کہ اس زمانہ کے متعلق جو اس کی تجویز اور اس کا فیصلہ ہے وہ اسے اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بخشے تا کہ اچھا بیج اچھی زمین میں مناسب موسم میں پڑے تا اعلیٰ سے اعلیٰ کھیتی پیدا ہو اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

جیسا کہ میں شروع میں بتا چکا ہوں انسانی زندگی کی سب دلچسپیاں ایک غیر متناہی تغیّر سے وابستہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرتے ہوئے غیر متناہی تغیّر کے سامان بھی اس کے ساتھ ہی پیدا کر دیئے ہیں لیکن جب تغیّر صحیح اصول پر ہو تو وہ تغیّر ترقی کا موجب ہوتا ہے اور جب غلط اصول پر ہو تو تنزل کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن سکون اپنی ذات میں ہمیشہ ہی تنزل کے سامان مخفی رکھتا ہے جو قوم ساکن ہو جاتی ہے وہ ہمیشہ نیچے ہی گرتی چلی جاتی ہے پس ہمارے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ یہ امر ہمیشہ اپنے مد نظر رکھیں کہ اس دنیا میں سکون موت کا نام ہے۔ جو کھڑا ہو گا وہ مر جائے گا یا پیچھے کی طرف دھکیلا جائے گا جو دوسرا نام موت کا ہے۔ پس انہیں چاہیئے کہ اپنی تعلیم کے ختم کرنے پر وہ ایک منٹ بھی یہ خیال نہ کریں کہ اب شاید ان کے لئے آرام کا وقت آگیا ہے انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ آرام کا نہیں بلکہ کام کا وقت آگیا ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں اسلامی اصول کے لحاظ سے ہر وقت انسان کے لئے آگے قدم بڑھانا ضروری ہے اور اس کی ترقی اس بات کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف قدم ہی آگے نہ بڑھائے بلکہ اس جہت میں بڑھائے جس جہت کی طرف خدا تعالیٰ کی صفات اشارہ کر رہی ہوں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جو کام کریں دُعا کر کے اور خدا تعالیٰ سے مدد مانگ کر کریں۔ میں خصوصاً اُن طلباء کو جنہوں نے کہ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی ہے اور ڈگریاں حاصل کی ہیں اُن کے فرض کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ جب انہوں نے تعلیم شروع کی تھی تو شاید انہیں یہ بات معلوم نہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بڑے کام کے لئے استخارہ مقررہ فرمایا ہے اور شاید اپنے لئے مضامین کا انتخاب کرتے وقت انہوں نے دُعاؤں میں کوتاہی کی ہو۔ لیکن اب جبکہ اُن کی پہلی منزل ختم ہو گئی ہے اور دُوسری منزل شروع ہونے والی ہے جو شاید اور بہت سی منزلوں کا پیش خیمہ ہو گی۔ تو انہیں چاہیئے کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق خدا تعالیٰ سے دُعا کر کے اپنے لئے راہِ عمل تجویز کریں۔

شاید بعض لوگوں کے دِل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یونیورسٹی کی ڈگری لینے والوں اور کالج کے طلباء کو مخاطب کرتے وقت یہ کیا راگ چھیڑ دیا گیا ہے۔ لیکن میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ ہی اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ اسلام ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کو ہم سیاسی وجوہ کی بنا پر ترک کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسلام نام ہے خدا تعالیٰ، اس کی قدرتوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لانے کا۔ اگر ہم اپنے دعووں کی بنیاد اسلام پر رکھتے ہیں تو ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی زندہ قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں ورنہ ہمیں نہ کسی الگ جتھہ کے بنانے کی ضرورت تھی اور نہ یہ مناسب تھا۔ دوسرے مذاہب بطور جبّہ کے پہنے جاسکتے ہیں مگر اسلام نہیں۔ اسلام ایک زندہ مذہب ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں دخل انداز ہوتا ہے اور ہمارے ہر فعل پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم اسلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر خُدا اور اس کے رسولؐ کو تصرف حاصل ہو گا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دُنیا کی ترقی اور تنزل میں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو ایک بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ اگر ہم ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے ہم درحقیقت ایک

"پاکستان کا مطالبہ ہی اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ اسلام ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کو ہم سیاسی وجوہ کی بنا پر ترک کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسلام نام ہے خدا تعالیٰ، اس کی قدرتوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لانے کا۔ اگر ہم اپنے دعووں کی بنیاد اسلام پر رکھتے ہیں تو ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ہم خدا پر ایقین رکھتے ہیں اور اس کی زندہ قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں ورنہ ہمیں نہ کسی الگ جتھہ کے بنانے کی ضرورت تھی اور نہ یہ مناسب تھا۔"

مُردہ خدا کا مجسمہ پُوجتے ہیں اور بُت پرستوں سے زیادہ ہماری حیثیت نہیں اور ظاہر ہے کہ مُردہ خدا ایک مُردے گھوڑے کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتا کیونکہ مُردہ گھوڑے کا چمڑا اور اس کی ہڈیاں تو کام آسکتی ہیں۔ لیکن مُردہ خدا کی کوئی چیز بھی کسی کام نہیں آسکتی۔ اگر ہم خدا تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں ایک زندہ خدا پر یقین رکھنا ہوگا اور اگر ہم ایک زندہ خدا پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اس دُنیا کے روزمرہ کے کاموں میں دخل رکھتا ہے۔ اور ہماری ترقی یا تنزّل کے ساتھ اس کی قدرتوں اور اس کے فضلوں کا بھی تعلق ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ہم یہ یقین رکھیں گے تو پھر ہمیں اپنی کوششوں کے ساتھ اس سے استعداد کرنے کی بھی ضرورت ہوگی اور یہی چیز ہے جس کو اسلام پیش کرتا ہے۔

”یاد رکھو کہ تم پر صرف تمہارے نفس کی ہی ذمہ داری نہیں۔ تم پر تمہارے اس ادارے کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہیں تعلیم دی ہے اور اس خاندان کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہاری تعلیم پر خرچ کیا ہے۔ خواہ بالواسطہ خواہ بلاواسطہ۔ اور اس ملک کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہارے لئے تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اور پھر تمہارے مذہب کی بھی تم پر ایک ذمہ داری ہے۔“

پس میں ان نوجوانوں کو جو تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی زندگی کے دوسرے مشاغل کی طرف مائل ہونے والے ہیں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے قانون کے مطابق سکون کے حاصل کرنے کی بالکل کوشش نہ کرو بلکہ ایک نہ ختم ہونے والی جد وجہد کے لئے تیار ہو جاؤ اور قرآنی منشاء کے مطابق اپنا قدم ہر وقت آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہو اور اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگتے رہو کہ وہ آپ کو صحیح کام کرنے اور صحیح وقت پر کام کرنے اور صحیح ذرائع کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر اس کام کے صحیح اور اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج پیدا کرے۔

یاد رکھو کہ تم پر صرف تمہارے نفس کی ہی ذمہ داری نہیں۔ تم پر تمہارے اس ادارے کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہیں تعلیم دی ہے اور اس خاندان کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہاری تعلیم پر خرچ کیا ہے۔ خواہ بالواسطہ خواہ بلاواسطہ۔ اور اس ملک کی بھی ذمہ داری ہے جس نے تمہارے لئے تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اور پھر تمہارے مذہب کی بھی تم پر ایک ذمہ داری ہے۔ تمہارے تعلیمی ادارے کی جو تم پر ذمہ داری ہے وہ چاہتی ہے کہ تم اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھے طور پر استعمال کرو۔ یونیورسٹی کی تعلیم مقصود نہیں ہے۔ وہ منزل مقصود کو طے کرنے کے لئے پہلا قدم ہے۔ یونیورسٹی تم کو جو ڈگریاں دیتی ہے وہ اپنی ذات میں کوئی قیمت نہیں رکھتیں بلکہ ان ڈگریوں کو تم اپنے آیندہ عمل سے قیمت بخشتے ہو۔ ڈگری صرف تعلیم کا ایک تخمینی وزن ہے۔ اور ایک تخمینی وزن ٹھیک بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ہو سکتا ہے۔ محض کسی یونیورسٹی کے فرض کر لینے سے کہ تم کو علم کا ایک تخمینی وزن حاصل ہو گیا ہے۔ تم کو علم کا وہ فرضی درجہ نصیب نہیں ہو جاتا جس کے اظہار کی یونیورسٹی ڈگری کے ساتھ کوشش کرتی ہے۔

اگر ایک یونیورسٹی سے نکلنے والے طالب علم اپنی آیندہ زندگی میں یہ ثابت کر دیں کہ جو تخمینی وزن ان کی تعلیم کا یونیورسٹی نے لگایا تھا ان کے پاس اس سے بھی زیادہ وزن کا علم موجود ہے تو دنیا میں اس یونیورسٹی کی عزّت اور قدر قائم ہو جائے گی۔ لیکن اگر ڈگریاں حاصل کرنے والے طالب علم اپنی بعد کی زندگی میں یہ ثابت کر دیں کہ تعلیم کا جو تخمینی وزن ان کے دماغوں میں فرض کیا گیا تھا۔ ان میں اس سے بہت کم درجہ کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ تو یقیناً لوگ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یونیورسٹی نے علم کی پیمائش کرنے میں غلطی سے کام لیا ہے۔ پس تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یونیورسٹیاں اُتنا طالب علم کو نہیں بناتیں جتنا کہ طالب علم یونیورسٹیوں کو بناتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ ڈگری سے طالب علم کی عزت نہیں ہوتی بلکہ طالب علم کے ذریعہ سے ڈگری کی عزّت ہوتی ہے۔ پس تمہیں اپنے پیمانہء علم کو درست رکھنے بلکہ اس کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے اور اپنے کالج کے زمانہ کی تعلیم کو اپنی عمر کا پھل نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اپنے علم کی کھیتی کا بیج تصور کرنا چاہیئے۔ اور تمام ذرائع سے کام لے کر اس بیج کو زیادہ سے زیادہ بار آور کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے تا کہ اس کوشش کے نتیجہ میں ان ڈگریوں کی عزّت بڑھے جو آج تم حاصل کر رہے ہو اور اس یونیورسٹی کی عزّت بڑھے جو تمہیں یہ ڈگریاں دے رہی ہے اور تمہاری قوم تم پر فخر کرنے

کے قابل ہو اور تمہارا ملک تم پر اعلیٰ سے اعلیٰ اُمیدیں رکھنے کے قابل ہو۔ اور ان اُمیدوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھے۔

تم ایک نئے ملک کے شہری ہو۔ دنیا کی بڑی مملکتوں میں سے بظاہر ایک چھوٹی مملکت کے شہری ہو۔ تمہارا ملک مالدار ملک نہیں ہے ایک غریب ملک ہے۔ دیر تک ایک غیر حکومت کی حفاظت میں امن و سکون میں رہنے کے عادی ہو چکے ہو۔ سو تمہیں اپنے اخلاق اور اپنے کردار بدلنے ہوں گے اور نئے ماحول کے مطابق بنانے ہوں گے۔ تمہیں اپنے ملک کی عزّت اور ساکھ دنیا میں قائم کرنی ہوگی۔ تمہیں اپنے وطن کو دُنیا سے روشناس کرانا ہوگا۔ ملکوں کی عزت کو قائم رکھنا بھی ایک دشوار کام ہے۔ لیکن ان کی عزّت کو بنانا اس سے بھی زیادہ دشوار کام ہے اور یہی دشوار کام تمہارے ذمہ ڈالا گیا ہے۔ تم ایک نئے ملک کی نئی پود ہو۔ تمہاری ذمہ داریاں پُرانے ملکوں کی نئی نسلوں سے بہت زیادہ ہیں۔ انہیں ایک بنی بنائی چیز ملتی ہے۔ انہیں آباء واجداد کی روائتیں وراثت میں ملتی ہیں مگر تمہارا یہ حال نہیں ہے۔ تم نے ملک بھی بنانا ہے اور تم نے نئی روائیتں بھی قائم کرنی ہیں۔ ایسی روائتیں جن پر عزّت اور کامیابی کے ساتھ آنے والی بہت سی نسلیں کام کرتی چلی جائیں اور اُن روایتوں کی راہنمائی میں اپنے مستقبل کو شاندار بناتی چلی جائیں۔ پس دوسرے قدیم ملکوں کے لوگ ایک اولاد ہیں مگر تم ان کے مقابلہ پر ایک باپ کی حیثیت رکھتے ہو۔ وہ اپنے کاموں میں اپنے باپ دادوں کو دیکھتے ہیں۔ تم نے اپنے کاموں میں آیندہ نسلوں کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ جو بنیاد تم قائم کروگے آیندہ آنے والی نسلیں ایک حد تک اس بنیاد پر عمارت قائم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ اگر تمہاری بنیاد ٹیڑھی ہوگی تو اس پر قائم کی گئی عمارت بھی ٹیڑھی ہوگی۔ اسلام کا مشہور فلسفی شاعر کہتا ہے کہ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

یعنی اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو اس پر کھڑی کی جانے والی عمارت اگر ثریّا تک بھی جاتی ہے تو ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ پس بوجہ اس کے کہ تم پاکستان کی خشت اوّل ہو تمہیں اس بات کا بڑی احتیاط سے خیال رکھنا چاہیئے کہ تمہارے طریق اور عمل میں کوئی کجی نہ ہو کیونکہ اگر تمہارے طریق اور عمل میں کوئی کجی ہوگی تو پاکستان کی عمارت ثریّا تک ٹیڑھی چلتی چلی جائے گی۔

بیشک یہ کام مشکل ہے لیکن اتنا ہی شاندار بھی ہے۔ اگر تم اپنے نفسوں کو قربان کر کے پاکستان کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردوگے تو تمہارا نام اس عزّت اور اس محبت سے لیا جائے گا جس کی مثال آیندہ آنے والے لوگوں میں نہیں پائی جائے گی۔ پس میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی نئی منزل پر عزم، استقلال اور علو حوصلہ سے قدم مارو۔ قدم مارتے چلے جاؤ اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے قدم بڑھاتے چلے جاؤ کہ عالی ہمت نوجوانوں کی منزل اول بھی ہوتی ہے منزل دوم بھی ہوتی ہے منزل سوم بھی ہوتی ہے لیکن آخری منزل کوئی نہیں ہوا کرتی۔ ایک منزل کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری وہ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے سفر کو ختم کرنا نہیں جانتے۔ وہ اپنے رخت سفر کو کندھے سے اتارنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ ان کی منزل کا پہلا دَور اس وقت ختم ہوتا ہے جب کہ وہ کامیاب و کامران ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور اپنی خدمت کی داد اس سے حاصل کرتے ہیں جو ایک ہی ہے جو کسی کی خدمت کی صحیح داد دے سکتا ہے پس اے خدائے واحد کے منتخب کردہ نوجوانو! اسلام کے بہادر سپاہیو! ملک کی امیدوں کے مرکز و قوم کے سپوتو۔ آگے بڑھو کہ تمہارا خدا تمہارا دین تمہارا ملک اور تمہاری قوم محبت اور امید کے مخلوط جذبات سے تمہارے مستقبل کو دیکھ رہے ہیں۔

”پس میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی نئی منزل پر عزم، استقلال اور علو حوصلہ سے قدم مارو۔ قدم مارتے چلے جاؤ اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے قدم بڑھاتے چلے جاؤ کہ عالی ہمت نوجوانوں کی منزل اول بھی ہوتی ہے منزل دوم بھی ہوتی ہے منزل سوم بھی ہوتی ہے لیکن آخری منزل کوئی نہیں ہوا کرتی۔“

پارٹیشن کے زمانے کی چند یادداشتیں

جماعتِ احمدیہ کے ہوائی جہازوں کی مختصر کہانی

محترم سیّد محمد احمد صاحب

آخری قسط

تقسیم ہند کے وقت جب پنجاب میں فسادات کی ابتدا ہوئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی دور بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ عنقریب قادیان کے زمینی راستے غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر افواج کا فالتو سامان نیلام ہو رہا تھا۔ اس میں سے آپ نے ایک طیارہ خریدنے کا حکم فرمایا۔ اس جہاز کے پائلٹ مکرم سیّد محمد احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسماعیلؓ تھے۔ آپ انڈین رائل ایئر فورس میں پائلٹ تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران آپ نے مختلف محاذوں پر خدمات انجام دیں تھیں۔ جب آپ کو جماعت کا جہاز اُڑانے کا حکم ملا تو آپ فوراً قادیان پہنچ گئے۔ جماعت نے بعد میں دو جہاز اور خریدے جو پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد تک جماعت کے زیرِ استعمال رہے۔ سیّد محمد احمد صاحب نے اِن جہازوں کے بارے میں ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون الفضل میں تین قسطوں میں شائع کیا ہے۔ ذیل میں المنار اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے ان اقساط کے کچھ اقتباسات سیّد محمد احمد صاحب کے الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔

اس زمانے کا ایک اور اہم واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ قادیان سے لاہور جانے والا پہلا ہجرت کرنے والوں کو قافلہ ۲۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو روانہ ہوا۔ اس قافلے میں حضرت مسیح موعودؑ کے خاندان کی خواتین بشمول حضرت اماں جان بھی شامل تھیں۔ اس قافلے کی سب سے اگلی گاڑی نیلے رنگ کی ڈاج ویگن تھی۔ جو صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب کی ملکیت تھی۔

اس دن میں بھی ہوائی جہاز میں قادیان سے لاہور آرہا تھا۔ اڑان کے دوران میں نے اس قافلے کو بٹالہ اور امرتسر کے درمیان اسی نیلی گاڑی کی وجہ سے پہچانا۔ اگرچہ مجھے کوئی آرڈر نہ تھے مگر محض شوقیہ اس قافلے کے قریب سڑک کے نزدیک ایک کھیت میں لینڈ کر گیا۔ جہاز کا انجن چلتا چھوڑا اور چند قدم چل کر قافلے کے اگلے حصہ تک پہنچ گیا۔ قافلہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں نے خیریت معلوم کی۔ چونکہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اس لئے قافلہ بھی روانہ ہو گیا اور میں بھی لاہور پرواز کر گیا۔ لاہور پہنچ کر میں نے شیخ بشیر احمد صاحب (امیر جماعت لاہور) کو اطلاع کا فون کر دیا کہ قافلہ خیریت سے ہے اور تقریباً فلاں ٹائم تک لاہور پہنچ جائے گا۔ اس وقت تقریباً ہر ذہن میں یہی خیال تھا کہ لاہور تھوڑا سا عرصہ رہ کر جونہی امن کے حالات ٹھیک ہوں گے سب لوگ قادیان واپس چلے جائیں گے۔ کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ یہ مستقل ہجرت ہے۔ حضور ۳۱/ اگست کو بذریعہ کار قادیان سے لاہور آئے۔ آپ کسی قافلے میں نہیں آئے بلکہ آپ کی کار کے ساتھ ایک فوجی حفاظتی دستہ تھا۔ جس کا انچارج ایک فوجی کمانڈو انگریز کپتان تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی بہت سے انگریز فوجی افسران انڈین اور پاکستانی فوج میں موجود تھے۔

ستمبر 1947ء کے بالکل شروع میں مشرقی پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے ہوائی جہازوں کو ضبط کرنے کے آرڈر جاری کر دئے۔ یہ آرڈر ایسے وقت میں آئے جب میں اور ڈپٹی لطیف صاحب اپنے اپنے جہازوں میں لاہور سے قادیان آرہے تھے۔ اور ہم دونوں کے جہازوں میں ایک ایک جماعتی کارکن بھی سوار تھا اور ساتھ چند ضروری سامان کے آئیٹم بھی ساتھ تھے۔ جو پولیس کا افسر یہ آرڈر لے کر آیا تھا وہ پہلے خدام الاحمدیہ کے دفتر پہنچا اور وہاں اس وقت کے انچارج کو یہ آرڈر دکھائے۔ خدام الاحمدیہ کے دفتر والوں کو علم تھا کہ ہماری لاہور سے قادیان واپسی عنقریب متوقع ہے۔ اس لئے انہوں نے چار خدام کارکنان ہمارے لینڈنگ گراؤنڈ کی جانب بھگائے۔ اور انہیں خاموشی سے ہدایت دی کہ جونہی ہم لینڈ کریں تو آپ چاروں جلدی جلدی دونوں ہوائی جہازوں سے ضروری سامان اتارلیں اور دونوں پائلٹوں کو فوری طور پر لاہور واپس چلے جانے کی ہدایت کر دیں اور ہمیں بتادیں کہ جہاز ضبط کرنے کے آرڈر آچکے ہیں۔ اس لئے فوری طور پر لاہور کے لئے اڑ جائیں۔ ادھر خدام الاحمدیہ کے دفتر کے انچارج نے آرڈر لانے والے پولیس افسر اور اس کے ساتھ سپاہیوں کو چائے پانی کے چکر میں ڈال دیا اور انہیں بہت سی دلچسپ غیر متعلقہ باتوں میں لگائے رکھا اور انہیں اتنی دیر اپنے دفتر میں بٹھائے رکھا جب تک ہم قادیان سے لاہور کے لئے روانہ نہیں ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے قادیان لینڈ کرتے ہی خدام الاحمدیہ کے کارکنوں نے ہمیں اشارے سے بتایا کہ

انجن بند نہ کریں اور پھر فوری طور پر ہمارے ساتھ آنے والے کارکنوں کو اور ان کے ساتھ سامان کو جلدی جلدی اتارا۔ اس کے فوراً بعد ہم اپنے اپنے جہازوں کو موڑ کر لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور پونے گھنٹے بعد والٹن ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ مگر اس دن کے بعد بھی میں روزانہ والٹن سے اڑتا اور پرواز کر کے قادیان جاتا۔ اور قادیان کے ارد گرد کا مکمل فضائی سروے کرتا یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں قادیان کے ارد گرد کوئی ایسی کارروائی تو نہیں ہو رہی جس سے قادیان پر حملے کا ڈر ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھتا کہ قادیان سے احمدی مہاجرین کے روزانہ لاہور آنے والے قافلے کو راستے میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آ رہی۔ مگر چند دن بعد یہ سروے بھی بند کرنا پڑا کیونکہ قادیان میں مقیم پولیس اور فوجی یونٹس نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔

پہلی بار جب میرے ہوائی جہاز پر قادیان کے اوپر اڑتے ہوئے فائرنگ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے معجزانہ طور پر بچا لیا۔ L-5 جہاز میں فرنٹ سیٹ یعنی کاک پٹ کے دونوں اطراف کے دروازوں کے اوپر آدھا حصہ ایسی کھڑکی کا تھا جس کا شیشہ خصوصی قسم کے پلاسٹک بنامی Perspax کا بنا ہوا تھا۔ ان کھڑکیوں کو اندر کی طرف کھول کر نیچے کی طرف بٹن کیا جا سکتا تھا۔ میں اکثر دونوں سائڈ کھڑکیوں کو نیچے بٹن کر کے (یعنی آدھا کھول کر) فلائی کرتا تھا۔ اسی طرح جہاز کے اوپر کی چھت بھی Perspax کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں سے شیشے کی طرح صاف نظر آتا تھا۔

اس دن جب فضائی سروے کے لئے میں قادیان گیا اور تعلیم الاسلام کالج سے مینارۃ المسیح کی جانب بہت نیچی پرواز کر رہا تھا تو ریتی چھلہ سے کچھ پہلے جب میں تقریباً قادیان کے پولیس تھانہ کے اوپر تھا کہ مجھے نیچے سے فائرنگ کی آواز آئی۔ اگرچہ فائرنگ کی آواز نیچے اور بائیں طرف سے آئی تھی مگر اتفاقاً میں نے اپنا سر تھوڑا سا دائیں جانب جھکایا تا کہ دائیں جانب کی کھلی کھڑکی سے نیچے دیکھوں۔ اسی لمحہ ایک زوردار ”ٹھک“ سا دھماکہ ہوا اور اوپر چھت والی Perspax کے چند پلاسٹک کے ذرات میری گردن کی بائیں جانب مجھے گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اور اس کے ساتھ اسی لمحہ میرے سر کے بائیں حصہ کے بالوں میں میں نے سرسراہٹ محسوس کی۔ میں نے فوری طور پر ہوائی جہاز کو سنبھالا اور بلندی کی جانب کے ساتھ ساتھ دائیں جانب جہاز کو موڑا پھر جب اوپر دیکھا تو چھت کی Perspax میں میرے سر کے عین اوپر گولی لگنے کی وجہ سے سوراخ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ جب سر پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ سر کے کچھ بال بھی جل گئے ہیں۔ یہ ایک عجیب معجزہ تھا کیونکہ اگر اس وقت اگر میں نے اپنا سر ذرا سا دائیں جانب جھکایا نہ ہوتا یا سیدھا ہی رکھا ہوتا یا بائیں جانب جھکایا ہوتا تو گولی میرے سر میں سے گزر جاتی۔ اور آپ یہ کہانی نہ پڑھ رہے ہوتے۔

دوسرا معجزانہ واقعہ چند دن بعد پیش آیا۔ یہ ستمبر کے شروع کے دنوں کا ہے۔ حضور نے ایک ضروری لفافہ قادیان بھیجنا تھا جو قادیان کی انتظامیہ کو پہنچانا تھا۔ میں نے عرض کی اگر آپ مجھے ایک ترنگا streamer بنوا دیں تو میں یہ لفافہ اس میں ڈال کر تعلیم الاسلام کالج کے سامنے والی گراؤنڈ (جہاں خدام الاحمدیہ کا ایک عارضی کیمپ ہے) کے قریب ہوائی جہاز سے پھینک سکتا ہوں اور اس طرح یہ ضروری لفافہ جماعت قادیان کی انتظامیہ تک پہنچ جائے گا۔ پھر تفصیل سے میں نے بتایا کہ جنگ عظیم کے دوران برما میں ہم ایسے ہی سٹریمرز Streamers استعمال کرتے تھے اور ان کے ذریعہ ہی جنگل میں چھپے ہوئے اپنے کمانڈرز کے دستوں کو خصوصی پیغامات پھینکا کرتے تھے۔ تفصیلاً میں نے یہ بھی بتایا کہ ایک کینوس کا لفافہ نما بیگ (9 انچ x9 انچ) چاہیئے۔ جس کی ایک سائیڈ کھلی ہو مگر اس کو بند کرنے کے لئے اس کی کھلی سائڈ پر ایک مضبوط کاج نما بٹن ہونا چاہیئے اور اس کی دوسری سائیڈ پر تین رنگین کپڑے کی پٹیاں (4 انچ x3 فٹ لمبی) سی دی جائیں کہ ہر پٹی کا صرف ایک سرا بیگ کے ساتھ سلا ہو مگر دوسرا نہیں۔ ایک پٹی نیلی۔ دوسری سرخ اور تیسری زرد۔ تا کہ جب یہ بیگ گرے تو یہ پٹیاں نہ صرف بیگ کو سنبھالیں بلکہ ان کی وجہ سے گرتا ہوا بیگ دور سے نظر بھی آئے۔ آپ کے حکم سے لاہور کی لجنہ نے راتوں رات دو بہترین سٹریمرز تیار کر دئے۔ جن میں سے ایک میں میں نے حضور کا ضروری لفافہ بند کر لیا اور والٹن جا کر قادیان کے لئے روانہ ہو گیا۔ چونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے جہاز پر زبردست فائرنگ ہو گی اس لئے میں نے اس دن قادیان کی فضائی زیارت کرنے والے کسی شوقین کو ساتھ نہیں بٹھایا۔ دوسرے میں نے اپنے ذہن میں یہ پلان بنایا کہ اول تو میں سارا راستہ بہت نیچی پرواز کر کے قادیان پہنچوں گا تا کہ وہاں پہنچ کر ہی پتہ چلے کہ ہوائی جہاز سر پر آ گیا ہے۔ دور سے پتہ نہ چل سکے۔ بعد میں سیدھا ٹی آئی کالج کے سامنے والی گراؤنڈ میں پہلی بار میں ہی یہ سٹریمر گرا دوں گا تا کہ جب تک پولیس والے اور فوجی سپاہی گولیاں چلانے کی تیاری پکڑیں میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ اور اس کے بعد جلدی سے مڑ کر نیچی پرواز کرتا ہوا واپس لاہور آ جاؤں مگر جونہی میں اپنے ٹارگٹ سے چند سو گز پہلے ذرا سا اونچا ہوا تو بائیں جانب سے مشین گن کا مسلسل فائر میرے جہاز پر شروع ہو گیا یہ مشین گن

میرے جہاز پر فائر کر رہی تھی مگر الحمد للہ میرے جہاز کو کوئی گولی نہیں لگی۔ میں سیدھا اڑتا گیا اور ٹارگٹ کے عین اوپر تقریباً ایک سو فٹ کی بلندی سے میں نے وہ سٹریمر نیچے پھینک دیا۔ پھر دائیں مڑا اور بہت نیچا اڑتا ہوا واپس لاہور آ گیا۔ بعد کو ٹیلیفون سے پتہ چلا کہ حضور کا ضروری لفافہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔

اب وہاں کیا ہوا اس کی تفصیل بعد میں قادیان سے ان لوگوں کے لاہور آنے کے بعد پتہ چلی۔ جو اس وقت اس گراؤنڈ میں ڈیوٹی پر موجود تھے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب معجزانہ کہانی ہے۔ خدام الاحمدیہ کے دو کارکنوں نے جو وہاں ڈیوٹی پر موجود تھے وہ سٹریمر گرتا دیکھا اور وہ اس کی جانب بھاگے مگر دوسری طرف سے (اس گراؤنڈ سے جو کالج سے کچھ دور شمال مغرب میں جامعہ احمدیہ کی بلڈنگ سے کچھ دور شمال کی طرف واقع ہے اور جہاں پولیس اور فوج کی ایک پوسٹ تھی) کے بھی دو بندے اس طرف کو بھاگے۔ یہ پولیس اور فوج والے اسی گراؤنڈ میں تھے جہاں سے مشین گن نے میرے ہوائی جہاز پر تابڑ توڑ فائرنگ کی تھی۔ ان سرکاری کارندوں نے ٹی آئی کالج کی جنوبی گراؤنڈ (جہاں جلسہ سالانہ ہوا کرتا تھا اور جہاں میں نے وہ سٹریمر گرایا تھا) پہنچ کر ہمارے خدام الاحمدیہ کے دونوں کارندوں کو پکڑ لیا اور حکم دیا کہ جو چیز بھی ہوائی جہاز نے گرائی ہے ہمارے سپرد کر دو۔ اغلباً درختوں کی اوٹ کی وجہ سے ان سرکاری کارندوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی چیز ہوائی جہاز سے گرتی نہیں دیکھی تھی۔ ہمارے خدام نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ جس پر سرکاری کارندوں نے ہمارے خدام کی مکمل تلاشی لی مگر ان کے پاس سے کچھ نہ نکلا۔ جب پولیس والے کارندے وہاں سے چلے گئے تو ہمارے خدام پریشان تھے کہ وہ سٹریمر کہاں گیا جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے گرتا ہوا دیکھا تھا۔ اس لئے یہ دونوں خدام ادھر ادھر نگاہ مار رہے تھے کہ شاید وہ سٹریمر کہیں دور زمین پر پڑا ہوا مل جائے۔ جب سرکاری کارندے بہت دور چلے گئے اور نظر سے غائب ہو گئے تو وہاں کھڑا ہوا ایک دس گیارہ سال کا بچہ جس نے میلی قمیص اور نیکر پہنی ہوئی تھی ہمارے خدام کے پاس آیا۔ اس نے اپنی قمیص اٹھائی اور وہ لپٹا ہوا سٹریمر اپنی قمیص کے نیچے سے نکال کر ہمارے خدام کے سپرد کر دیا اور کہا کہ یہ میرے قریب گرا تھا مگر جب دور سے میں نے پولیس والوں کو آتے دیکھا تو میں نے اسے اٹھا کر لپیٹ کر اپنی قمیص کے نیچے چھپا لیا۔ چنانچہ حضور کا وہ ضروری لفافہ قادیان کی جماعت کی انتظامیہ کو صحیح سلامت پہنچ گیا۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ کیا وہ کوئی فرشتہ تھا یا ایک بے حد سمجھدار غریب بچہ مگر اس کا نام اور ولدیت کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔

تیسرا معجزانہ واقعہ حضور کے لاہور پہنچنے کے کئی دنوں بعد پیش آیا۔ یہ اغلباً ستمبر کے تیسرے ہفتہ کی بات ہے۔ ان دنوں ہزاروں ہزار کی تعداد میں مسلمان پناہ گزین جن کی اکثریت مشرقی پنجاب سے تھی، سخت بری حالت میں پاکستان آئے تھے اور اس زمانے میں والٹن ائیر پورٹ کے قریب کراچی جانے والی ریلوے لائن کے اس پار اس بڑے مہاجر کیمپ میں ٹھہرے ہوئے تھے جو اب "باب پاکستان" کہلاتا ہے۔ ان مہاجرین کے ساتھ ان کے ہزاروں ہزار مویشی بھی آئے تھے جو اس ریلوے لائن کے دونوں جانب سارے علاقے میں چرتے پھرتے تھے اور ان میں سے بہت سے مویشی ریلوے لائن کراس کر کے والٹن ائیر پورٹ کے دونوں رن وے کے درمیان والے گھاس کے وسیع میدانوں میں آزاد چرتے پھرتے تھے اس لئے کہ ان کے لئے کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔

اب ان دونوں خطرات سے لاعلم اور بے خبر ہوتے ہوئے خاکسار اور مرزا منیر احمد صاحب تیاری کر کے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز کا انجن سٹارٹ کیا اور چھوٹے رن وے پر اڑنے کے لئے داخل ہوئے۔ یہاں سب کچھ چیک کرنے کے بعد انجن کو فل تھراٹل Full Throttle دے کر پرواز شروع کرنے کے لئے ہوائی جہاز کو دوڑایا۔ ابھی تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہی دوڑے ہوں گے کہ ایک زور دار دھماکے کے ساتھ جہاز کسی چیز سے ٹکرایا اور اس خوفناک ٹکر سے جہاز کا اگلا حصہ نیچا ہو کر زمین سے لگا اور دم اوپر کی طرف اٹھ گئی اور سامنے کی جانب ایک قلابازی کھا کر الٹ گیا اور الٹا ہی زمین پر گھسٹتا گیا۔ اور پھر رک گیا۔ اگرچہ میرے دونوں گھٹنوں پر چوٹیں آئی تھیں مگر میں جلدی سے اپنا حفاظتی بند کھول کر اتر کر بھاگا کیونکہ جہاز کے الٹنے کی وجہ سے پٹرول ٹینک میں سے پٹرول بہنے کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں آگ نہ لگ جائے کیونکہ پٹرول کی بو مجھے آ رہی تھی۔ مگر جہاز سے دور بھاگنے کی بجائے میں جلدی سے اس لئے پلٹا کیونکہ بھائی منیر اپنی سیٹ میں الٹے لٹکے پھنسے ہوئے تھے۔ جہاز الٹنے کی وجہ سے ان کی سیٹ زمین سے دس فٹ اونچی ہو گئی تھی اور ان سے اپنا حفاظتی بند بھی نہیں کھل رہا تھا۔ میری مدد سے وہ مشکل سے نکلے بلکہ سیدھے زمین پر گرے۔ جہاز بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ٹارچ جلا کر دیکھا کہ معلوم ہو سکے کہ ہم کس چیز سے ٹکرائے تھے۔ پتہ چلا کہ ایک گائے سے ٹکرائے تھے۔ جو اس چھوٹے رن وے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس کا آدھا دھڑ ہمارے قریب پڑا تھا اور باقی آدھا تقریباً پچاس گز پیچھے یعنی ٹکرانے والی جگہ پر۔ اس

سروے کے بعد ہم رن وے کے آگے کی جانب بڑھے۔ ابھی تقریباً ایک سو گز گئے ہوں گے کہ سامنے سے ہمیں ایک سپاہی نے چلا کر Halt کہہ کر روکا۔ قریب گئے۔ ٹارچ جلائی۔ دیکھا کہ سامنے ایک B.A.O.C کا مسافر بردار Dakota جہاز عین رن وے کے درمیان میں کھڑا ہے اور Halt چلّانے والا وہ گارڈ تھا جو اس ہوائی جہاز کا پہرہ دے رہا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں اور بھائی منیر دونوں لرز گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس بیچاری گائے کو ہماری جانیں بچانے کے لئے اس وقت وہاں نہ بھیجا ہوتا تو ہم اس Dakota سے اتنی تیز رفتار سے ٹکراتے کہ وہ جہاز بھی اور ہم بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ کیونکہ وہاں تک پہنچتے تک ہماری رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہو چکی ہوتی۔ سچ مچ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس رات بالکل معجزانہ طور پر بچالیا۔ الحمد للہ۔

اس حادثہ کے بعد ہمارے پاس ایک جہاز کم ہو گیا۔ مگر چونکہ انہیں دنوں میں ڈپٹی محمد لطیف صاحب حضور سے اجازت لے کر اپنے لئے پاکستان میں کوئی موزوں ملازمت ڈھونڈنے کے لئے چلے گئے۔ اس لئے اب صرف جماعت کے پاس صرف ایک ہوائی جہاز تھا اور ایک پائلٹ یعنی خاکسار۔

چند دنوں کے بعد ایک دن اطلاع ملی کہ امرتسر کے شمال مغرب کی جانب انڈیا کے بارڈر کے اندر ایک قصبہ بنام اجنالہ میں سینکڑوں مسلمان بھوکے پیاسے اپنے گھروں کے کوٹھوں پر مجبوراً اس لئے بیٹھے ہیں کیونکہ علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں نے اس قصبہ کے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے تاکہ انہیں اس حالت میں ہی بھوکا پیاسا ماردیں۔ حضور اس اطلاع سے بے حد پریشان ہوئے اور فوراً لاہور کی جماعت کو آرڈر دیا کہ لنگر میں تندوری روٹیاں ہزاروں کی تعداد میں تیار کی جائیں اور ان کے ایسے پیکٹ بنائے جائیں جن میں چار پانچ روٹیاں پیک ہوں اور مجھے آرڈر دیا کہ تم نے یہ روٹیوں کے پیکٹ ہوائی جہاز میں لے جاکر اس قصبہ میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے لئے پھینکنے ہیں۔ ہم ایک جیپ میں بہت سی روٹیوں کے پیکٹ لے کر والٹن گئے۔ اس دن میرا معاون حضور کا ڈرائیور نذیر تھا۔ L-5 کی پچھلی سیٹ کے پیچھے جتنی بھی خالی جگہ تھی میں نے اور نذیر نے ساری جگہ ان روٹیوں سے بھردی۔ اڑے اور اس قصبہ کے اوپر پہنچ کر اپنی طرف سے بے حد احتیاط سے وہ پیکٹ ایک ایک دو دو کر کے برسانے شروع کئے۔ وہ بیچارے لوگ اتنے بھوکے تھے کہ جس کے ہاتھ پیکٹ آتا تھا تو اس سے زیادہ تگڑا اس سے یہ پیکٹ چھین لیتا تھا اور اس باہمی چھینا جھپٹی میں بہت سی روٹیاں ضائع ہو گئیں۔ دوسرے یہ کہ لنگر والوں اور ہم سے یہ غلطی ہو گئی کہ پیکٹ پرانے اخبارات کے کاغذوں سے بنائے گئے تھے اس لئے ہوائی جہاز سے گرتے ہی بہت سے پیکٹوں کے اخباری کاغذ ہوا میں ہی پھٹ جاتے تھے اور اس کی روٹیاں ننگی زمین پر گر جاتی تھیں۔ مگر پھر بھی ان بے چارے بھوکوں کے لئے کچھ نہ کچھ سامان ہو گیا تھا۔ اس مشن کو مکمل کرنے کے بعد ہم نے والٹن واپس آکر روٹیوں کے پیکٹ بھرے اور وہاں جاکر گراتے رہے جب تک کہ پیکٹ ختم نہ ہو گئے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد کشمیر والی جنگ شروع ہو گئی اور مجھے اسی سلسلہ میں کئی بار سیالکوٹ اور راولپنڈی اپنے جماعتی ہوائی جہاز میں جانا پڑا۔ چونکہ اس زمانہ میں Flood کے باعث لاہور تا گوجرانوالہ جی ٹی روڈ کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی اور زیر آب آگئی تھی اور زمینی راستے لمبے عرصہ تک بندر ہے۔ اس لئے مجھے بہت سی فلائٹیں سیالکوٹ۔ گوجرانوالہ اور پنڈی کے لئے کرنا پڑیں جن کا تعلق جماعتی کاموں سے کم ہوتا تھا۔ زیادہ مسلم لیگ اور آزاد کشمیر کے لیڈروں کے سرکاری کاموں سے ہوتا تھا۔

غالباً اکتوبر ۱۹۴۷ء کا آخر تھا جب حضور کو کراچی سے کسی نے اطلاع دی انہیں De-Haviland ہوائی جہاز بنانے والی کمپنی کے آل انڈیا دفتر جو کراچی میں واقع تھا سے پتہ چلا ہے کہ ان کے پاس کراچی میں چار Fox Moth قسم کے چھوٹے مسافر بردار جہاز موجود ہیں۔ یہ ہوائی جہاز کینیڈا سے کسی ہندو پارٹی نے امپورٹ کئے تھے۔

پارٹیشن کے فوراً بعد پاکستان گورنمنٹ نے ان چاروں جہازوں کو پاکستان سے باہر جانے سے روک دیا۔ اس لئے De-Haviland کمپنی کے لئے اب ضروری تھا کہ وہ انہیں پاکستان میں ہی فروخت کرے۔ فی ہوائی جہاز قیمت دو ہزار برٹش پونڈ یعنی Rs 29,200 تھی۔ ان چاروں جہازوں میں سے دو ہوائی جہاز سندھ گورنمنٹ نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر کھوڑو کے اندرون سندھ کے دوروں کے لئے خرید لئے۔ یہ اطلاع ملنے پر حضور نے فوری طور پر مجھے کراچی بھیجا۔ اس اجازت کے ساتھ کہ اگر مناسب ہو تو میں یہ دونوں جہاز خریدلوں۔ ایک جماعت کے لئے جس کی قیمت جماعت ادا کرے گی اور دوسرا آزاد کشمیر کی گورنمنٹ کے لئے جس کی قیمت وہ ادا کرے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت کو آزاد کشمیر کے انتظامی معاملات میں کسی قدر عمل دخل تھا۔ چنانچہ میں کراچی میں کئی ہفتہ رکا رہا اور جب دونوں ہوائی جہاز Assemble ہو گئے اور باقاعدہ ان کی ٹیسٹ فلائٹ کرنے کے بعد پہلے ہوائی جہاز کو (جو جماعت کا تھا) کراچی سے براستہ جیکب آباد۔ ملتان لاہور

لے آیا۔ پھر چند دن بعد ٹرین سے سفر کر کے واپس لاہور کراچی گیا اور دوسرا جہاز جو آزاد کشمیر گورنمنٹ کا تھا کو فلائی کر کے اسی روٹ سے لاہور لایا اور دو چار دن کے بعد اسے لاہور سے راولپنڈی (چکلالہ ایئر پورٹ) پہنچا کر اسی ہوائی جہاز کو آزاد کشمیر کی حکومت (جن کا ایک دفتر راولپنڈی میں بھی تھا) کے حوالے کر دیا۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت نے اپنے ہوائی جہاز کو ٹھیک طرح سے نہیں سنبھالا۔ اس کی فلائنگ اور ٹیکنیکل دیکھ بھال اناڑیوں کے اور غیر ذمہ دار لوگوں کے سپرد کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوماہ میں ہی وہ جہاز دوبار ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا اور آخری بار ٹیک آف کرنے کے بعد ایک درخت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ شکر ہے اس کا اناڑی پائلٹ چھوٹی موٹی چوٹیں کھا کر بچ گیا مگر وہ ہوائی جہاز بالکل ختم ہو گیا۔

اب ہمارے پاس دو ہوائی جہاز ہو گئے۔ چند ماہ تو جماعتی ضروریات اور کشمیر کی جنگ کی ضروریات کی وجہ سے ہم بہت مصروف رہے۔ مگر آہستہ آہستہ جب رابطہ کے ذرائع پاکستان میں بہتر ہونے شروع ہو گئے تو جماعت کے لئے ہوائی جہازوں کی ضرورت روز بروز کم ہونی شروع ہو گئی۔

مجھے یاد ہے کہ جس دن ربوہ کے افتتاح کے لئے حضور نے ربوہ جانا تھا اس سے ایک دو دن پہلے میں اس نئے ہوائی جہاز (Fox Moth) میں ربوہ گیا اور اس جگہ لینڈ کیا جہاں اب قصر خلافت ہے۔ اس وقت یہ سارا علاقہ (بلکہ محلہ دارالصدر کا سارا علاقہ بشمول وہ علاقہ جہاں اب صدر انجمن اور تحریک جدید کے دفاتر اور دیگر جماعت کے کارکنوں کے مکانات ہیں) بالکل اونچا نیچا پتھریلا اور بے حد خراب میدان تھا۔ وہاں چند گھنٹے ٹھہرنے کے بعد میں نے ایک مددگار کے ساتھ مل کر چونے کی لائنیں اس لئے لگائیں تا کہ ربوہ میں ایک لینڈنگ گراؤنڈ کی جگہ تجویز ہو جائے۔ مگر بعد میں یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کے علاوہ جب ایک بار حضور جماعتی دورے کے لئے سندھ جا رہے تھے تو میں بھی چند دنوں کے لئے اس جہاز میں براستہ ملتان۔ جیکب آباد کراچی گیا۔ اور پھر وہاں سے اس جہاز میں حیدرآباد اور وہاں سے کنری جا کر لینڈ کیا۔ مگر چونکہ حضور کا ہیڈ کوارٹر وہاں سے ۲۵ میل دور شمال میں یعنی محمود آباد سٹیٹ میں تھا۔ اس لئے میں گھوڑے کی سواری کر کے محمود آباد گیا اور وہاں سید عبدالرزاق شاہ صاحب مرحوم کے پرجوش تعاون سے ہم نے مل جل کر جلدی جلدی ایک لینڈنگ گراؤنڈ بالکل حضور کے دفتر اور گھر کے نزدیک بناڈالی اور پھر گھوڑے کی سواری کر کے واپس کنری گیا اور وہاں سے ہوائی جہاز کو محمود آباد لے آیا۔ اور پھر چند دنوں کے بعد واپس براستہ کراچی لاہور آ گیا۔ لاہور آنے کے بعد جماعت کے مختلف کاموں کے سلسلے میں کئی پروازیں کیں۔ یہ وہ دن تھے جب کشمیر کی جنگ شروع ہو چکی تھی اور جس جنگ میں (یعنی ۱۹۴۸ء میں) جماعت نے بھی ایک والنٹیرز کی انفنٹری بٹالین کھڑی کی اور اس کو پاکستانی فوج کے ساتھ کشمیر کی جنگ میں بھیجا تھا۔ اس بٹالین کا ٹریننگ سنٹر سرائے عالمگیر (جہلم) سے چند میل جنوب میں اپر جہلم کے کنارے پر تھا۔ جب بھی میں جماعتی کام سے لاہور سے راولپنڈی جاتا یا آتا تو اس سنٹر کے اوپر سے گزرتے ہوئے انہیں Buzz ضرور کرتا۔ یاد رہے کہ اس بٹالین کا نام فرقان بٹالین تھا اور اس کے کمانڈر کرنل حیات صاحب تھے اور اس بٹالین نے اپنے فرنٹ پر اپنے سپرد علاقے کا نہ صرف پرزور دفاع کیا بلکہ پاکستان کی مستقل فوج کی بٹالینوں کے برابر کارکردگی دکھائی۔

ایک بار حضور بھی میرے ساتھ سی Fox Moth جہاز میں سیالکوٹ سے لاہور تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ سیدہ مہر آپا مرحومہ اور حضور کی بیٹی صاحبزادی امۃ الباسط بیگم صاحبہ مرحومہ بھی تھیں۔ اس دن ہم نے موجودہ لاہور ائیر پورٹ پر لینڈ کیا۔ کیونکہ اس دن کسی ٹیکنیکل وجہ سے والٹن ائیر پورٹ بند تھا۔ موجودہ لاہور ائیر پورٹ اس وقت ائیر فورس کا بیس تھا اور اس زمانے میں سول ہوائی جہازوں کو وہاں لینڈ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح ایک بار جماعت کے جہاز کو کوئٹہ بھی لے کر جانا تھا مگر سندھ میں فلڈ آ جانے کی وجہ سے اور زمینی راستے بند ہو جانے کی وجہ سے ایک ٹیکنیکل مجبوری کی وجہ سے ہوائی جہاز کو جیکب آباد ائیر پورٹ پر ہی چھوڑنا پڑا۔

۱۹۵۰ء میں حضور نے جماعت کے دونوں ہوائی جہازوں کو کراچی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک ایک کر کے دونوں ہوائی جہازوں کو کراچی لے گیا۔ پہلے تو کراچی کی جماعت نے انہیں حضور کے منشاء کے مطابق فروخت کرنے کی کوشش کی مگر عرصہ تک جب وہ بک نہ سکے اور چونکہ انہیں کراچی ائیر پورٹ کے ہینگرز میں رکھنے کے اخراجات اور انہیں صحیح حالت میں رکھنے کے اخراجات بہت زیادہ تھے اس لئے حضور نے دونوں جہاز ایک ادارے کو جماعت کی طرف سے تحفتاً دے دئے۔

مینار و گنبد کی حقیقت تاریخ عالم کی روشنی میں

کیا قرآن و حدیث میں مسجد کے مینار اور گنبد بنائے جانے کا حکم موجود ہے؟

عبد الہادی ناصر (نیویارک) سابق لیکچرار تعلیم الاسلام کالج ربوہ

مسلمان اپنی مسجد کو مسجد اس لئے کہتے ہیں کہ اس جگہ سجدہ کیا جاتا ہے۔

مسجد کا مادہ "سَجَدَ" ہے جس کے معنی سجدہ کرنے کے ہیں اور مسجد اسم مکان ہے یعنی وہ جگہ جہاں سجدہ کیا جاتا ہے۔ مسجد کیسی بنانی چاہئے؟ اس کے متعلق ضروری بات یہ ہے کہ وہ قبلہ رُخ ہو۔ مسجد کے متعلق آنحضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ "مجھے خدا کی طرف سے پانچ ایسی باتیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں"۔ ان پانچ چیزوں میں سے ایک بات یہ تھی کہ "میرے لئے ساری زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنادی گئی ہے"۔ (بخاری)

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ:

"فضائل اسلام میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اسلام کے معابد ہاتھ سے نہیں بنائے جاتے اور خدا کی خدائی میں ہر مقام پر خدا کی عبادت ہو سکتی ہے۔ اینما تولو فثم وجہ اللہ (بقرہ، رکوع 4) جس طرف تم منہ کرلو وہیں خدا کو پاؤ گے۔ جس مقام پر خدا کی عبادت کی جائے وہی مقام مقدّس ہے اور اسی کو مسجد سمجھ لیجئے۔ مسلمان چاہے سفر پر ہو یا حضر میں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے۔ چند مختصر اور پُر جوش فقروں میں اپنے خالق سے اپنے دل کا عرض حال کرلیتا ہے۔ اس کی نماز اتنی طویل نہیں ہوتی کہ جی گھبرا جائے اور نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ اپنے عجز انکساری کا اظہار اور خداوند عالم کی عظمت اور جلال کا اقرار اور اس کے فضل ورحمت پر توکل۔ عیسائی کیا جانے کہ اسلام میں عبادت کا مزا کیسا کوٹ کوٹ کے بھرا ہے"۔ (تنقید الکلام، لائف آف محمد از سید امیر علی)

جب ہم مسجد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلی مسجد قُبا بنی جب آنحضرت ﷺ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے۔ اور دوسری مسجد 622ء میں مسجد نبوی بنی جس کا رقبہ 115x98 فٹ تھا۔ مسجد کی دیواریں مٹی کی بنائی گئیں اور چھت کھجور کے تنے کی ڈالی گئی اور کھجور کے پتوں سے چھت کو ڈھانپ دیا گیا۔ چھت ایسی تھی کہ جب بارش ہوتی تو اندر کیچڑ ہو جاتا تھا۔

یہ تھا نقشہ آنحضرت ﷺ کی مسجد کا، مگر خدا تعالیٰ نے اس مسجد کو وہ برکت عطا فرمائی کہ دنیا میں جتنی مسجدیں ہیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے صحابہ جو آپ ﷺ کے عشاق صادق تھے اور جن کے لیل و نہار مسجد نبوی میں گزرتے تھے۔ ان کی عبادت اس بظاہر خستہ حالت مسجد میں وہ رنگ لائی جس نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا جس کو دیکھ کر آج کا مورخ حیران نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ "مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ہمیں چند آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مدینہ کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد میں جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی تھی اور جو ذرا سی بارش سے بھی ٹپکنے لگ جاتی تھی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور جب ہم ان کے قریب پہنچ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں کہ ہم قیصر و کسریٰ کو کس طرح شکست دیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چند سالوں کے اندر اندر واقعی ایسا ہی ہو گیا اور ان بے سروسامان اور کمزور درویشوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو پاش پاش کر دیا۔" غرض اشد دشمنوں نے بھی تسلیم کر لیا کہ مسلمانوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہ ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صرف بلند و بالا، میناروں، گنبدوں اور، محرابوں سے مزین مسجدوں میں عبادت کرنے سے روحانیت پیدا نہیں ہوتی مسجدوں کو سادہ رکھنے سے بھی عبادت کا اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کسی جگہ پر بھی مسجدوں کے مینار، گنبد و محراب بنانے کا حکم نہیں ملتا۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بلند وبالا مساجد تعمیر کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یقیناً تم ان کی زینت کرو گے جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو مسجد

بنائی وہ سادہ تھی۔ کوئی مینار و گنبد نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد مسجدوں کے ڈیزائن میں نمایاں فرق آنا شروع ہو گیا۔

گنبد اور مینار کی تاریخ

قدیم مصریوں، رومیوں اور یونانیوں نے اپنی عمارتوں میں محراب اور گنبد کو استعمال کیا ضرور لیکن بہت کم عمارات میں محراب کو استعمال کیا گیا۔ رومیوں نے ایسی محرابیں بنائیں جو بڑے وزن کو تھام سکتی تھیں۔ پھر تمام تہذیبوں نے رومیوں کی بنائی ہوئی محرابوں کو اپنایا۔ بازنطینی ماہرین تعمیرات اور مشرقی یورپ نے تواتر کے ساتھ محرابیں اپنی عمارات میں بنانی شروع کیں۔ دوسری تہذیبوں نے محرابوں میں مزید تنوع پیدا کیا۔ مثال کے طور پر مسلمان ماہرین تعمیرات نے مزید اس میں ردوبدل کر کے نوک دار محرابیں اور گھوڑے کی نعل کی شکل کی محرابیں بنائیں جن کو انہوں نے مسجدوں میں استعمال کیا۔ رومیوں کی محرابیں جو تھوڑی بہت ردوبدل کر کے بنائی گئیں ظاہر کرتی ہیں کہ رومن فنِ تعمیر بہت زیادہ اثر پذیر ہوا۔

پھر رومیوں نے محراب بنانے کے فن کو اور ترقی دے کر عمارات کی چھتیں بنائیں جو گنبد کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ یہ طرز تعمیر جو گنبدوں کی شکل میں نمودار ہوا دنیا کی اکثر عمارات میں ظاہر ہوا۔ فرانس کے مشہور گرجا گھر Gothic Cathedral اس کی مثال ہے۔ تاج محل میں بھی رومن فن تعمیر کا بہت بڑا اثر ہے۔ جب مسلمان فوج نے شام، عراق، فلسطین اور ایران کی فتح کیا تو عیسائیوں اور یہودیوں کی خوبصورت عبادت گاہوں کو دیکھ کر ان کو بھی خیال پیدا ہوا کہ ہماری سادہ مسجدیں میناروں اور گنبدوں کے بغیر اچھی نہیں لگتیں۔ لہٰذا انہوں نے ان علاقوں کے ماہرین تعمیرات کو ملازم رکھ لیا اور ساتویں صدی کے آخر میں مینار و گنبد مسلمانوں کی عبادت گاہوں یعنی مسجدوں کی علامت بن گئے اور تیزی کے ساتھ عربوں نے اس ڈیزائن کو مذہبی روایت کے طور پر اپنا لیا۔ یروشلم کی گنبد خضراء پہلی عمارت تھی جس کو 691ء میں امیہ کے خلیفہ عبدالمالک نے مکمل کیا۔ اس کے گنبد کا ڈیزائن بازنطینی تھا۔ بازنطینی ماہرین نے دمشق کی امیہ مسجد تعمیر کی۔ حاجیہ صوفیہ کی دلکش عمارت جو کہ استنبول میں ہے، اس نے اسلامی فن تعمیر پر بہت اثر ڈالا۔ جب عثمانیوں نے بازنطینیوں پر فتح حاصل کی تو انہوں نے حاجیہ صوفیہ کو جو کہ گرجا گھر تھا مسجد میں تبدیل کر دیا۔ آج کل یہ خوبصورت عمارت عجائب گھر کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اسلام جس پہلی تہذیب سے متعارف ہوا وہ ایران تھا۔ اسلام کے ابتدائی سالوں میں مسجدوں پر ایرانی فنِ تعمیر نے اثر ڈالا۔ مسلمان ماہرین تعمیر نے انہیں خطوط پر اپنی تعمیر کی بنیاد رکھی اور بیشتر، ایرانی طرز تعمیر کو اپنی تعمیرات میں شامل کیا۔ بہت سے شہروں کو مثال کے طور پر بغداد کو فیروز آباد شہر کے نمونوں پر بنایا گیا جو کہ ایران کا شہر ہے۔ خلیفہ منصور نے شہر کا نقشہ بنانے کے لئے دو بڑے ماہرین تعمیرات کو ملازم رکھا جن کا نام نوبخت اور دوسرے کا نام ماشاء اللہ تھا۔ ماشاء اللہ یہودی تھا اور دوسرا نوبخت زرتشتی تھا۔ دونوں ایران کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں دو مینار بنانے کا رواج ایرانیوں کے ہاں سے آیا تھا اور پھر یہ اثر مغلوں کے فن تعمیر پر اثر انداز ہوا اور پھر صفوی تعمیر میں منتقل ہو گیا۔ مسجدوں میں مینار و گنبد کا اثر اس وقت ہوا جب مسلمانوں میں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ محراب و گنبد کے ناموں سے زمانہ جاہلیت کے لٹریچر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبہ کا نام (یعنی گنبد) شعروں میں عام استعمال ہوا ہے۔ عرب مینار گنبد کو تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیالات کے مطابق یہ چیزیں ان کو برکت بخشتیں اور ان کی حفاظت کرتی ہیں۔ مسلمانوں نے مینار اور گنبد کو مسجد کا جزو بنالیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ مسلمانوں کا ورثہ ہے۔ علماء نے مسجدوں کو خوبصورت بنانے پر بہت بحث کی ہے۔ بہت سے علماء نے اس کی یعنی گنبد اور مینار بنانے کی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح مسجدوں کا تقدس پامال ہو گا۔ خاص طور پر ان کا یہ خیال تھا کہ عیسائیوں کے گرجا گھروں اور یہودیوں کے عالیشان معبدوں کی نقل کر کے مسجدوں کی شکل کہیں بگڑ نہ جائے۔ کیونکہ وہ رومن بازنطینی فن تعمیر کا بہترین شاہکار تھے آج کل بہت سے قدامت پسند مسجدوں پر مینار اور گنبد بنانے کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ امیہ خلیفہ معاویہ نے میناروں کی تعمیر کو بہت سراہا۔ وہ چاہتے تھے کہ چرچوں اور سینیگال کی نقل کر کے ان جیسے مینار اور گنبد بنائے جائیں۔ عیسائی اپنے چرچ میں جو مینار بناتے تھے ان کو Light Tower کہتے تھے جہاں سے لوگوں کو عبادت کے لئے بُلایا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جو مینار بنائے ان سے اذان دے کر لوگوں کو نماز کے لئے بُلایا جاتا ہے۔ مینار کو مینار کیوں کہا جاتا ہے؟ عربی میں نار کے معنی آگ کے ہیں۔ مینار وہ جگہ ہے جہاں آگ جلائی جاتی ہے۔ جس کو Light Tower کہتے ہیں۔

کیا مینار مسجد کا لازمی جزو ہے؟ اس کے بارے میں ایک انگریز سکالر K.A.C Crewell کہتا ہے کہ مینار مسجد کا لازمی جزو نہیں ہے کیونکہ محمد ﷺ نے جو مسجد مدینہ میں بنائی اس کا کوئی مینار نہیں تھا۔ 41 سال بعد یعنی محمد ﷺ کی وفات کے 41 سال بعد 673 میں دمشق میں مینار بنایا گیا اور پھر بعد میں مینار کو مسجد کی علامت

سمجھا جانے لگا۔ جہاں سے موذّن اذان دیتا ہے۔ پھر مسجد کے چار کونوں میں مینار بنائے جانے لگے۔ پہلی دفعہ مینار دمشق کی مسجد میں بنائے گئے۔ جیسا کہ شام کے چرچ کے چار مینار تھے۔ مینار پر اذان دینے کا رواج دمشق کے مینار سے ہوا جو چرچ کا مینار تھا۔ جس کو ٹیمپل آف پیگن کہا جاتا تھا۔ جو شام کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ مسلمان وہاں نماز ادا کیا کرتے تھے اور پھر عامر کی مسجد تعمیر کی گئی جس کے چار مینار بنائے گئے جو شام کے چرچ کی طرح تھے۔ مینار کو مسجد کی علامت کے طور پر باقاعدہ 707ء سے جانا جانے لگا۔ جب مدینہ کی مسجد نبوی کو دوبارہ تعمیر کیا گیا تو پہلی دفعہ چار مینار بنائے گئے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے یہ کہیں نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے گنبد و مینار کا کہیں حکم دیا ہو اور یہ کہا ہو کہ گنبد و مینار کے بغیر مسجد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ایک حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”میں تم کو بلند و بالا مساجد تعمیر کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی عبادت گاہیں بنائی ہیں (یعنی مینار اور گنبد کے ساتھ)“۔ پس یہ ثابت ہوا کہ گنبد و مینار مسجد کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہی یہ اسلامی ورثہ ہے۔ پھر یہ کس برتے پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مینار و گنبد اسلامی نشان ہے۔ ہر مذہب اپنی مرضی سے جیسا چاہے اپنی عبادت گاہ بنا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے اپنی مسجد پر مینار و گنبد بنانے پر عیسائیوں نے کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ ان کے ماہرین تعمیرات نے خود اپنے کلیسا کو سامنے رکھتے ہوئے مسجد کا ڈیزائن مینار و گنبد کے ساتھ بنایا۔ یہ عیسائیوں اور یہودیوں کی رواداری تھی کہ انہوں نے اپنے مینار و گنبد کی نقل پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ ”یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ“ (اعرف ۳۲) اے ابنائے آدم ہر مسجد میں اپنی زینت (یعنی لباس تقویٰ) ساتھ لے کر جایا کرو“۔ اس جگہ زینت سے مراد مینار و گنبد مسجد میں بنانے کا حکم نہیں بلکہ یہ حکم ہے کہ تم اپنی عبادت سے اس کی زینت بناؤ۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے اس کچی مسجد نبوی کو زینت بخشی۔ اگر زینت سے مراد مینار و گنبد ہوتی تو آپ یہ کبھی نہ فرماتے کہ مسجدیں بلند و بالا اور خوبصورت بنائی جائیں گی مگر نمازیوں سے خالی ہوں گی۔ اگر مسلمانوں کو گنبد و مینار اور محراب بنانے کا حکم ہوتا تو ایک جیسا نقشہ ہوتا اور کہا جاتا کہ اسلامی عبادت گاہوں کی شکل یہ ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر مسجد کا نقشہ الگ الگ ہے کسی مسجد کے چار مینار ہیں اور کسی کے دو مینار اور کسی کا ایک مینار۔ ہر مسجد کا گنبد جدا جدا ہے۔ کسی کی محراب ہے کوئی محراب کے بغیر ہے لہٰذا ایک مسجد دوسری مسجد سے نہیں ملتی۔ چونکہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے بعد عیسائیوں کے خوبصورت کلیساؤں کو دیکھ کر اپنی مسجدوں پر مینار و گنبد بنائے اس لئے ان کو یعنی میناروں کو مسجد کی علامت سمجھا جانے لگا۔

پاکستان میں جماعت احمدیہ کی مسجد سے مینار و گنبد اس لیے گرا دیئے گئے کہ احمدیوں کو اسلامی شعار کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔

طاہر احمد خان شہید

منصور احمد۔میری لینڈ

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دِکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

کچھ لوگ اس دنیا میں نہایت قلیل عرصہ کے لئے آتے ہیں مگر ایسی یادیں چھوڑ جاتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں اور ہمیشہ ہمیش کے لئے دل پر نقش رہتی ہیں۔ یہی حال خاکسار کے چھوٹے بھائی عزیزم طاہر احمد خان شہید کا تھا جو تعلیم الاسلام کالج کے فرسٹ ائیر (پری انجینیرنگ) کا طالبعلم تھا سترہ (۱۷) سال کی عمر میں دریائے چناب کی بے رحم لہروں سے ناآشنا ۲۱/ فروری ۱۹۷۴ء کو اس کی نذر ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ گو شہید عمر میں خاکسار سے پانچ برس چھوٹا تھا مگر ہم دونوں گہرے دوستوں کی طرح تھے۔ اللہ کیا بات کہ ربوہ کا پاکیزہ ماحول، عرفان کی باتیں کرنے والے محبوب خدا پر مرنے والے فرشتے سادہ لباس میں نظر آتے تھے۔اس ماحول میں پروان چڑھنے والا شہید بچپن سے اطفال الاحمدیہ کا سرگرم رُکن، جماعتی کاموں (خدام الاحمدیہ مرکزیہ) میں ہمیشہ آگے، کھیل کے میدان میں ایک منجھا ہوا کھلاڑی، فٹ بال، باسکٹ بال اور کرکٹ کا بہترین کھلاڑی بلکہ تعلیم الاسلام ہائی اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کپتان رہنے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ علمی میدان میں گو عمر نے اس کے ساتھ وفا نہیں کی مگر اس کا علمی مطالعہ بہت وسیع تھا جس کا اندازہ اس کی گفتگو سے بخوبی ہو تا تھا۔ خلافت لائبریری کا بہت عرصہ سے ممبر تھا۔اس کا لائبریری کا کارڈ ہمیشہ کتب کے اندراج کی مہروں سے پُر رہتا تھا۔فُرصت کے اوقات میں کتب کا مطالعہ کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ نہایت کم گو، ہمیشہ چہرے پر مسکراہٹ۔ کسی سے جھگڑا نہیں بلکہ جھگڑے کی فضا سے ہی دور رہتا تھا۔شُستہ مذاق۔ بڑوں کا ادب کرنے والا اور چھوٹوں سے نہایت شفقت سے پیش آنے والا ہر دلعزیز انسان تھا۔گھریلو کاموں کی ذمہ داری اس طرح ادا کرتا تھا کہ جیسے اس کے علاوہ گھر میں کوئی اور کام کرنے والا نہیں ہے۔ انسانوں کی خدمت، خصوصیت سے ناداروں کی خدمت۔ ان کا سودا سلف لانا اور ہمیشہ خدمت کیلئے حاضر رہنا اس کی طبیعت میں شامل تھا۔ خدمت خلق کا یہ دائرہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ جانوروں سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ شہید نے ایک طوطا اور ایک بِلّا بھی پال رکھا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور ان کے رزق کا انتظام کرنا بھی اپنا اوّلین فرض سمجھتا تھا۔ (یہ بِلّا شہید کی شہادت سے ایک یوم قبل گھر سے غائب ہو گیا۔ نامعلوم وہ کہاں گیا۔ شاید وہ بھی شہید کی شہادت کا غم برداشت نہ کر سکا اور ہمیشہ کے لئے رُوپوش ہو گیا) شہید کا جنازہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے پڑھایا جس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔ خاکسار کے والد ڈاکٹر محمد احمد مرحوم سے کسی دوست نے کہا "ڈاکٹر صاحب لگتا ہے آج اللہ تعالیٰ نے آپ سے ابراہیمی قربانی مانگی ہے"۔ اس پر والد صاحب مرحوم نے فرمایا "میں اس قربانی کے لئے تیار ہوں"۔ واللہ، مومن کی یہی شان ہوتی ہے۔ شہید کی شہادت پر احباب جماعت نے ہم غمزدہ دلوں پر خطوط، مضامین، نظموں اور تعزیتی قراردادوں کے رنگ میں مرہم رکھی۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔ کچھ عرصہ بعد خاکسار اور عبدالباری قیوم شاہد نے حکمِ ربّانی اُذکروا امواتکم بالخیر کے تحت شہید کا ذکر آئندہ نسلوں میں جاری رکھنے کے لئے ایک چھوٹا سا کتابچہ بنام "ہمارا غریب طاہر" شائع کیا جس میں شہید مرحوم سے متعلقہ تمام مضامین، خطوط اور نظموں کو یکجا کر دیا گیا۔

جانے والے نے تو جنت میں بسائی دنیا
رہنے والوں کا یہاں کیسے گزارا ہو گا

اکرم محمود اور چراغ خواب

احمد مبارک

اگر 'چراغ خواب' ایک شام مجھے دستیاب نہ ہوتی تو اکرم محمود کو میں شاید اُس طرح نہ جان پاتا۔ وہ میرے لئے ہمیشہ ایک بد دماغ، تند خو ہی رہتا جو اپنے ارد گرد کو ایک طرح حقارت سے دیکھنے کا عادی ہو اور اپنے قریب ترین دوستوں کو کاٹ دار فقروں سے زخم لگانے کو واحد تفریح سمجھتا ہو اور پھر فلک شگاف قہقہوں کے درمیان اُس دوست کو اطمینان سے رُخصت ہوتے ہوئے بھی دیکھتا رہے۔ اور آئندہ ملاقات پر اسی گرم جوشی سے استقبال بھی کرے۔ اور ایسے تمام ارادی اور غیر ارادی واقعات میں لطف الرحمان ایک کمک کے طور پر اکرم کے ساتھ فروکش ہوتا۔ لطفی بھی ایک کمال آدمی ہے۔ کئی دنوں تک راستے میں چلتے چلتے ملتے ہوئے ایک مصرع بار بار سناتا۔ ہم دو تین دوست بہت اصرار کرتے کہ بھائی دوسرا مصرع بھی مرحمت فرما دیجئے مگر وہ ظالم بس یہ کہتے ہوئے چل دیتا کہ بس ابھی ایک ہی مصرع ہوا ہے۔ ہم دیکھتے رہتے۔ اور مصرع دہراتے رہتے

ع۔ ٹوٹے پھوٹے گھر کا عالیشان دروازہ ہوں میں

بہت دنوں بعد علم ہوا کہ یہ اکرم محمود کا شعر ہے

مسکراہٹ میں چھپا دی میں نے غم کی کائنات
ٹوٹے پھوٹے گھر کا عالیشان دروازہ ہوں میں

پھر جستہ جستہ اکرم محمود سے تعارف ہوتا چلا گیا۔ انکے طنز اُنکے شعر اور انکی ہنسی۔

میں نے اکرم محمود کی پہلی نظم سُنی

اُداسی برف کے گالوں کی صورت دل پہ گرتی ہے

اور پھر یہ سُنا

تو اپنا زعم عطا توڑ دے کہ میں نے تو
لباس درد بھی اپنی خوشی سے پہنا ہے

وہ عمر، شخصیت اور شاعری کا عرصہ ایک مُنہ زور دھارے کی طرح تھا۔ شوخی، بے باکی، لفظ سے تعارف، ایک غیر سنجیدہ سنجیدگی، ایک خام سے نکلتی ہوئی زندگی کہیں متشکّل ہونے جا رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کو خیال سا گذرا کہ یہ خوبصورت سرکشی اپنی تجسیم سے پہلے کسی جگہ ٹھہر جائے تو؟ میؔر کا عجیب شعر ہے

گرمیِ عشق مانعِ نشو نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

یہ تمام دوست کم و بیش ایک ہی طرح کے لگتے۔ محمد خالد، ابرار احمد، انوار احمد، جمیل الرحمٰن، اکرم محمود، اقتدار حسین، طاہر مجید، لطف الرحمٰن، اور ادھر ہم یعنی افضال نوید، ظفر اللہ، احمد مبارک۔

یہ بڑے ہم کو قطعی در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بڑے اور کڑے معیار کی توقع میں یہ ہمیں گھورتے رہتے انہیں ہم کچھ بھی سناتے ان کی ناک کے نیچے نہیں آتا تھا۔

ایک مرتبہ اکرم محمود نے مجھے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا کہ اُس روز ریستوران میں چائے پیتے ہوئے ہم نے تمہیں بہت اعلٰی نظمیں سنائی تھیں مگر تمہارا ری ایکشن کوئی خاص نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا وہ زاہد ڈار کی نظمیں تھیں جو اُن دنوں تازہ تازہ فنون سے اور کچھ سینہ بہ سینہ پہنچی تھیں۔ میں شائد بہت اُداس ہو گیا تھا۔ انوار احمد مرحوم اور لطفی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ نظم یاد آئی تو میں اور اُداس ہو گیا۔

ہمارے گھر میں خوشی نہیں ہے
ہوئی۔ تو دروازے کھول دیں گے
پرائے ہر گز نہیں ہو آنا۔ ضرور آنا!! (افتخار جالب)

یہ ایک چھوٹا سا گروہِ شوق تھا اور بے کل کرتی ہوئی کوئی آواز انہیں کشاں کشاں

لئے جا رہی تھی۔

یہ وہ دوست اور شاعر تھے جن کے ذوقِ شعر اور سُخن کاری کے سنجیدہ معیار کے بارے میں کوئی شُبہ ہی نہیں تھا۔ یہ سب سر تا سر شاعر تھے اور اُسی دیار اُسی قصبے کی گلیوں میں چلتے تھے جو سڑک کے دونوں جانب نکلتیں۔ جن کے کناروں پر خود رو گھاس میں کہیں کہیں خواب تھے جو دن میں پیلے پھولوں کی صورت کھلے ہوتے اور راتوں کو ٹمٹماتے ہوئے چراغ بن جاتے۔ یہ سب دوست اُسی دُھند میں چلتے ایک دوسرے کی قربت میں پناہ ڈھونڈتے۔ تشنہ کام مگر ایک نامعلوم سمت جانے کی خوشی سے لبریز

اک نشہءکمیاب سے مخمور ہیں اب تک
جن آنکھوں نے دیکھا تھا کبھی خواب ہمارا

منڈیر پہ کوئی چشمِ تر تھی کہ آئینہ تھا
ستارہءشام دیکھتا تھا مکاں کی جانب

نکل بھی جاؤں میں دل سے گریز کرکے اگر
ستارہء شبِ غم تو سراغ رکھے گا

اکرم محمود کے باہر کی فضا میں ان دنوں حد درجہ شمولیت ناصر کاظمی، منیر نیازی، مجید امجد، پھر اقبال ساجد، ثروت حسین کی تھی اور پھر ظفر اقبال جن کی شاعری کے یہ سب اُن دنوں گھائل تھے کہ گھنٹوں اُس پر محوِ کلام رہتے لیکن اپنے قصبے کی گلیوں میں کہیں کہیں چھوٹی گھاس میں اُگے ہوئے پھولوں سے کچھ خواب اور رات کی دبیز تاریکی میں کچھ لرزتے ہوئے چراغ ان سب سے اُٹھا لیے تھے۔ چراغ خواب کے سفر سے وہ تمام رنگ جھلکتے ہیں اور پھر جلد ہی معدوم ہونے لگتے ہیں اور شاعر اپنی راہ کا تعین کرنے لگتا ہے

چمک گئی ہے جو بجلی تو تیز ربارش میں
نظر میں تیر گیا تیرے گاؤں کا رستہ

میں اپنے ساتھ لئے پھر رہا ہوں اپنی فضا
سو کچھ بدلتا نہیں ہے کہیں پہ جا کر بھی

یہ دھڑکنیں تو صدائیں ہیں چند ناموں کی
جلے ہیں خون کے اندر بھی دوستوں کے چراغ

بس ایسے ہی ہوتا ہے کہ ماحول کی پرورش کے بعد شاعر کا بطن وہ ذمہ داری سنبھال لیتا ہے اور باہر کی امیجری اُسکے اندر ایک نئی صورت سے تشکیل پانے لگتی ہے۔

وہیں جا کے کھولوں گا عمرِ رفتہ کے بیش و کم
اُسی راہ میں جو نہیں رہی میری منتظر

بن بھی کیسے سکتا تھا دوسروں سا ڈھب اپنا
سوچ تھی جدا سب سے خواب تھا عجب اپنا

اکرم محمود کی اُداسی کبھی کبھی خود ساختہ لگتی ہے۔خود پر طاری کئے ہوئے گریئے کو بار بار دیکھنے سے یونہی لگتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ واقعی ایک اداس آدمی ہے۔ آپ اس کے ساتھ یا اسکی شاعری کے ساتھ تادیر رہیں آپ کچھ ہی دیر میں ایک حُزنیہ کیفیت سے دوچار ہو جائیں گے۔

بظاہر غصے یا بے اعتنائی کے باوجود ایک شورشِ دروں اکرم کو اڑاتی ہے، ایک حسرت کسی راز کا پردہ چاک کرنے کو لپکتی ہے، کوئی بے کل کرتی ہوئی بات رات رات بھر اور تمام دن اسے جگائے رکھتی ہے۔ اس توڑ پھوڑ سے اسکے اندر بہت شور ہے جسے یہ دبائے ہوئے ہے اور ہانپتا ہے۔ اسکے کانپتے ہاتھوں کی لرزش، اسکی آنکھوں سے اُمڈتی برسات اُسکا پتہ دیتی ہے۔

یہ جو آج ہے یہ آنے والے کل میں روایت شمار ہونے کو ہے۔ بیس تیس چالیس برس کے ٹکڑے پرانے شمار ہونے لگتے ہیں۔ ہم زبان کے آغاز اور اردو شعر کی ابتداء کو آج کلاسیکی گردانتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ ۷۰، ۸۰، ۹۰ کی دہائیوں کی شاعری آج متروک ہونے کو ہے۔ بہت جلد اس دوران کے کام کو بھی فطری طور پر روایت کے خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ ہم یہ بات اُس شاعری یا ادب کی کر رہے ہیں جو کلیشے نہیں ہوتی، زندہ رہ جانے والی ہوتی ہے۔ وہ غیر معیاری بار بار دہرائے جانے والی، پامال اور اکتا دینے والی نہیں ہوتی۔ لیکن دراصل روایت وہ مضبوط اور لافانی شاعری ہے جو دہرانے کے باوجود ہر بار تازہ اور شگفتہ محسوس ہوتی ہے۔ اکرم محمود اسی روایت سے جُڑے اپنے آنے والے لمحے سے ہاتھ ملاتے ہیں جس طرح کہ ایک تازہ کار عمدہ اور اوریجنل شاعر ملاتا ہے۔

اُن کے لفظ چراغ، خواب، اضطراب، ریت، اختیار، گُل مراد، عکسِ نو، شاخِ سبز، خیال، صحرائے بدن، جہانِ تیرہ، بستیاں، رہگذارِ قدیم، ستارہ، ہیں۔ یہ لفظ پہلے بھی تھے آج بھی ہیں شاعر اُن کو کیسے تازہ کر دیتا ہے، دیکھئے

قیام کرنا مرے خون کی سرشت نہیں
کسی ستارے پہ ممکن نہیں ہے گھر میرا
میں پھول چنتا رہا اور خواب بُنتا رہا
مرے گمان سے کم تر رہا ہنر میرا

مہکنے لگتا ہے یہ باغ اُسکی خوشبو سے
جو پھول شاخِ حنا سے ابھی نہیں نکلا

کیسا طناز شاعر ہے۔

نکل کے آیا کہاں سے ہرا بھرا رستہ
فریب خواب ہے یا کوئی خوشنما رستہ
میں خود کو کھینچتا رہتا ہوں ایک رستے پر
پکارتا مجھے رہتا ہے دوسرا رستہ

چنانچہ وہ دبیز کُہر وہ تپتی دوپہر، وہ افسردہ شام، وہ جھیل کی طرح ٹھہری ہوئی رات والا قصبہ، اور اُس کی یاد کا یہ نوحہ

یہ کس دیار میں کن بستیوں کی یاد آئی
کہ جل اُٹھے مری پلکوں پہ آنسوؤں کے چراغ

لیکن گرمئ عشق ہجرت کے بعد کہاں آ کے مانع ہوئی کہ مجھے وہم سا ہوا کہ اکرم کی وہ شوخی، وہ تیزی، وہ لپک، وہ تیر کمان اُس نے شاید لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کی شخصیت کے اندر کوئی چیز بے شک گم ہو گئی ہے یا وہ خود ایک انجان جزیرے میں گم ہو گیا ہے۔ لیکن اُس سے اکرم کے شاعر کو بے پناہ طاقت ملنے کا پورا امکان ہے۔ کیونکہ برونِ ذات فقط شور ہے اور درونِ ذات وہی تماشہ ہے جسکے لئے میرؔ نے اشارہ کیا تھا کہ

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشہ نکلا

یقین نہیں آتا تو اکرم محمود کا یہ شعر ذرا دیکھ لیجئے

پاؤں اُٹھتے ہیں کسی موج کی جانب لیکن
روک لیتا ہے کنارہ کہ ٹھہر پانی ہے

ابھی چند روز اُدھر میں نے پوچھا مزاج کیسے ہیں اور آپ کے کِبر کا کیا حال ہے۔ مسکرادئے لیکن اگلے دن ٹیلیفون پر یہ شخص گریہ ناک ہو گیا۔ اور کہا کہ میں ایسا نہیں ہوں شاید اس طرح دِکھتا ہوں۔ تم جانتے ہو۔ میں نے محبت سے کہا۔ مجھے یقین ہے۔ بقول انوار احمد،

میں نے آواز نہ دی پاسِ ادب سے تجھ کو
اور تو ہے کہ تجھے وہم جفا ہے مجھ سے

کیونکہ جو شخص یہ شعر کہہ سکتا ہے کہ

آ کے اس پار بھی آواز تری آتی ہے
ایسے لگتا ہے بہت دور ابھی جانا ہے

اُس شوخ کے سارے قصور سارے غصے معاف۔

تعلیم الاسلام کالج قادیان کا حالیہ منظر

مُضطر عارفی

تیرے کوچے میں بکھر جاؤں اگر!
حادثہ اک یہ بھی کر جاؤں اگر!

اپنی غزلوں کو سجا کر طشت میں
تیرے دروازے پہ دھر جاؤں اگر!

عہد کی تصویر کو کر کے خفا
اس میں کوئی رنگ بھر جاؤں اگر!

میں ترا ہی عکس ہوں لیکن ترے
پاس سے ہو کر گزر جاؤں اگر!

کیوں بُلا بھیجا تھا اتنے پیار سے
اب کبھی واپس نہ گھر جاؤں اگر!

تجھ سے ملنا تو انوکھی بات ہے
خود سے مل کر بھی مکر جاؤں اگر!

حادثہ ہو جائے شہرِ ذات میں
اس ٹریفک میں ٹھہر جاؤں اگر!

کوئی سمجھے گا نہ اب میری زباں
لوٹ کر بارِ دگر جاؤں اگر!

عقل کے میدان میں کھا کر شکست
عشق کی بازی بھی ہر جاؤں اگر!

جی اُٹھوں مُضطر! ہمیشہ کے لیے
مُسکرا کر آج مر جاؤں اگر!

مبارک احمد عابد

ڈھلنے لگا سورج تو بڑھے شام کے سائے
تُم ایسے گئے ہو کہ نہیں لوٹ کے آئے

یارب یہ شبِ ہجر تو کاٹے نہیں کٹتی
بہتا ہے لہو آنکھ سے اشکوں کی بجائے

خاموش نگاہوں میں ہے اِظہارِ تمنا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں طوفان چھپائے

کل پرسوں کی اُمید نے برسوں کو سمیٹا
کب تک کوئی آشا کے چراغوں کو جلائے

جو شعر کہے میں نے فقط آپ کی خاطر
میری ہی زبانی نہ سُنے، آپ نے ہائے!

آنسو سے بڑا کوئی مصوّر نہیں عابد
جو خون سے جذبات کی تصویر بنائے

اکرم ثاقبؔ

جب تک میرا آب و دانہ باقی ہے
سورج کو بھی آگ لگانا باقی ہے

اس دھرتی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا
وقت کو آگے پیچھے لانا باقی ہے

سب طوفان گھٹائیں میرے بس میں ہیں
دریاؤں پہ شہر بسانا باقی ہے

اب تک خواب کا رشتہ اُس سے قائم ہے
بس اک اُس کا آنا جانا باقی ہے

میرے اپنے دار تلک ہیں لے آئے
دشمن سے بھی ہاتھ ملانا باقی ہے

نیند کی تصویروں سے لڑتا آیا ہوں
خوابوں سے اب آنکھ بچانا باقی ہے

خوشبو خواب خیال اور تیری یادیں
اپنا۔ کچھ سامان اُٹھانا باقی ہے

تنہائی چل شور مچائیں ہم مل کے
خاموشی کا جشن منانا باقی ہے

کاش مجھے اک اور جنم بھی مل جاتا
ثاقبؔ ماں کے پاؤں دبانا باقی ہے

سیّد ساجد احمد

بجھتے جاتے ہیں نگاہوں کے چراغ
روشنی سے بھر لو پھولوں کے ایاغ

مٹتے جاتے ہیں بہاروں کے نقوش
ہے چمن میں دامنِ گل داغ داغ

بیٹھ کے بیتی سنے دل کی کوئی
اس قدر کس کو ہے دنیا میں فراغ

تو نہیں آیا تو تنہا میں نہیں
میرے ہمدم ہیں مرے سینے کے داغ

حاصلِ گل بھی یہی ہے ایک شوق
پُر اسی سے ہے مرے دل کا ایاغ

گو بہت تاریک ہے راہِ حیات
دے رہے ہیں لو مرے سینے کے داغ

رشتہء حرف و جنوں قاتل نہ تھا
دے گیا ہے دم مجھے میرا فراغ

قید ہو مخلص حریمِ ذات میں
ڈھونڈنا ہے دیکھو کس کا سُراغ

بشارت جمیل
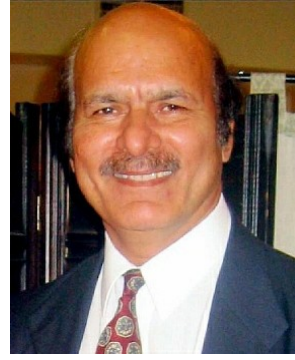
ملتے ہیں بھلا مے خوار کہاں اس دہر کے عریاں خانوں میں
ساقی کی نظر وہ کیا سمجھیں جو کھو جائیں پیمانوں میں

کچھ عشق سے حاصل ہو نہ سکا بیکار پھرے ویرانوں میں
اپنوں کو یونہی بدنام کیا رسوا بھی ہوئے بیگانوں میں

جانے کیوں وعظ اس واعظ کا سینوں کو برما جاتا ہے
مقبول ہے یہ فرزانوں میں مشہور ہے یہ دیوانوں میں

جو بات زباں سے نکلی تھی وہ راز بنی افسانہ ہوئی
جو راز تمہارے حسن کا تھا ملتا ہے میرے افسانوں میں

تو تشنہ لبوں کی پیاس بجھا عرفان کی مے کر ان کو عطا
دے جام پہ جام اور خُم پر خُم اور ناپ نہ اب پیمانوں میں

ہے نور کی کوشش بے معنی اور سوز کی خواہش لاحاصل
"وہ نور نہیں ہے شمعوں میں وہ سوز نہیں پروانوں میں"

آنکھوں کی تسلّی ہو نہ سکی، ہیں بُت بھی حزیں بُت خانوں میں
ہے راحت کا فقدان جمؔیل اس دُنیا کے سامانوں میں

محمد ظفراللہ خان

کھُلا ہے شہر بھی گلیاں بھی اور وہ در بھی
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کاسہء سر بھی

تھیں جس درخت سے پیوستہ گھر کی بُنیادیں
گرا تو ہو گیا پیوندِ خاک وہ گھر بھی

سمندروں کی تہوں میں ہوئی نمو جس کی
اُٹھی ہے لہر کوئی اُس گہر کے اندر بھی

بکھر گئی ہے سرِ بزم چشمِ نم کی گلیم
اُلٹ گیا ہے لہو سے بھرا وہ ساغر بھی

یہ مرد وزن ہیں ترے قافلے سے بچھڑے ہوئے
لُٹے نہ ان کے سروں سے فلک کی چادر بھی

عجب نہیں کہ میری داستاں سے ہٹ جائے
ٹکا ہے غار کے مُنہ پر جو ایک پتھر بھی

احمد مبارک

میں نے آدھی زندگی بسر کی
آدھی روٹی کھائی اور آدھے سانس لئے
آدھے راستے پہ رُک گیا
آدھا سویا اور جاگا
آدھا دن اور آدھی رات
آدھا خوف اور آدھے خواب
آدھے اندھیرے اور آدھی روشنی
میرے اعصاب ٹوٹ گئے
آدھی خزاں اور آدھی بہار کے بیچ
میرا اٹکا ہوا دل
آدھے تعلق کی اوٹ میں
رشتے دار اور بھائیوں نے میری آدھی قبر کھودی
میری ماں نے آدھی زندگی بچوں اور باپ کی بیگار میں کاٹی
آدھی میں نماز پڑہی اور تکیے میں منہ چھُپا کے روئی

میرے دُعا گو باُپ نے آدھی زندگی مزدوری کی
اور آدھی اپنی گمشدہ محبت کو دے دی
میں نے آدھی شاعری کی
اور آدھی نوکری
آدھی محبت کی
اور آدھی کتاب پڑھی
میرے آدھے دوست میرے آدھے دُشمن تھے
اور باقی آدھے دوستوں نے
اپنے اپنے مسلک کا غصّہ
میرے اوپر تھوکا اور اپنے برتن علیحدہ کر لئے
چنانچہ میں ان آدھے ادھورے لوگوں میں رہا
آدھی زمین پر چلا
اور آدھے آسماں کے نیچے
پورے خُدا سے ملا

دیس پنجاب

بشارت احمد بشارت۔ جرمنی

اپنے خیال دے پنچھی دے نال تہانوں وی لے جاواں
جی کردااے دیس پنجاب دی تہانوں سیر کراواں

چن چڑھے تے دھرتی تے کرناں دا مینہ برساوے
رات دی ووہٹی تاریاں دے نال اپنا آپ سجاوے
نکے نکے دیویاں دے نال جگنو دسن راہواں

کھمباں اُتے ساون دے وچ آئیاں انج بہاراں
گھڑے سراں تے چک کے کھڑیاں ہوون جیوں مٹیاراں
حسن دے اک اک نخرے دے وچ پیار کرن دیاں چاواں

رت بدلے تے ہریا برسن نال پھلاں دے چٹا
سرھوں دی ٹہنی دے نال کھہندا کنک دا گبھرو وٹا
وانگ شرابی رُکھ لہراؤندے رت دیاں ویکھ اداواں

وَل توری توں جوبن دا جد بھار نہ چکیا جاوے
نال کھلوتے توت نوں ایویں گھُٹ گھُٹ جپھیاں پاوے
ویکھ دوواں نوں چری دا ٹانڈا ٹھنڈیاں بھر داہاواں

سونے ورگیاں کھیتاں دے وچ باسمتی لہراوے
چھن چھن کردی نار جیوں کوئی جھانجر پئی چھنکاوے
جھونا کہندا جی کردااے رشتہ منگن جاواں

کھگیاں وچ مکئی دیاں چھلیاں اپنے آپ نوں کجن
مونہہ دے اُتے چنیاں لے مٹیاراں جیویں ہسن
لمے لمے پتے اُتے کر کے رکھدے چھاواں

کھیت دی رانی ترنوں والاں پتیاں ہیٹھ چھپاون
کڑیاں جیویں بانہواں اپنیاں چنی ہیٹھ لکاون
ایہناں سوہنیاں قدراں اُتوں صدقے واری جاواں

رنگ برنگے پھُل کلیاں نال باغاں دے وچ رہندے
واء وگے تے اک دوجے دی جھولی ڈِگ ڈِگ پیندے
ویکھ کے پیار ایہناں دے مُلاں کہندا افتوالاواں

امرت ورگا کھوہ دا پانی دین حیاتی آوے
رونداں چھڈ کے ٹنڈاں نوں، سب دی پیاس بجھاوے
مٹی دے وچ مل کے اُچا کر جاندا اے ناواں

ساون بھادوں وچ بدلاں دے نین شرابی رہندے
سڑدیاں ویکھ کے دھرتی نوں تے ایوں ڈُلھ ڈُلھ پیندے
ٹھنڈیاں ٹھار پھواراں دے وچ ہر کوئی آکھے نہاواں

ہریل طوطے باغاں دے وچ رل کے شور مچاون
کچے پھل نوں کٹ کٹ سٹن پکا پکا کھاون
مالی کہندا ایہہ نئیں مُڑدے کئی وار اُڈاواں

سوہنے پنج دریا دھرتی دے رل کے شور مچاون
اتھرے نے پر فیر وی دھرتی ماں نوں گل نال لاون
ساون بھادوں دے وچ اکثر روک کھلوندے راہواں

چاواں دی گٹھڑی نال ویرے بھین دے ویہڑے وڑدے
نکی بھین لئی شکر دوپہرے چودھویں دے چن چڑھدے
شُکرانے دی چوری اُتے جشن منائے کاواں

چڑیاں دے چنبے دے وانگوں دھی زندگی ساری
پلک بسیرا بابل دے گھر لمی فیر اُڈاری
گڈیاں پھڑ کے روندے بابل تائیں چپ کرواں

سدا اسلامت رہے اوہ دھرتی رب دے اگے عرضی
چماں تے گل لاواں اوہنوں میرے دل دی مرضی
وچ پردیساں سون نہ دیتا اوہدے شہر گراواں

میرے دیس دے دشمن بنتے سجن رہ گئے تھوڑے
مُلاں دے کرتوت نے قوم دے لیکھیں پائے روڑے
تیرے باجھوں میرے ربا کس دے در تے جاواں

وچ پردیساں کی کریں گا یاراں نال بہاراں
قانوناں دے ایس پنجرے دے وچ بُلبلیاں اج اُڈاراں
ویچ آزادی لیا بشارت کم نئیں آونا ناواں

اشعار جو ضرب المثل بن گئے

(ماخوذ)

بعض مصرعے اور بعض اشعار ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ ایسے مکمل اشعار شاعر کے نام کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن تخت سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کے حوالے سے یہ تاثر عام پایا جاتا ہے کہ یہ علامہ اقبال کا شعر ہے جبکہ یہ شعر کسی گمنام شاعر کا ہے۔

اسی طرح امام دین گجراتی کے نام سے برّصغیر میں سب آشنائی رکھتے ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ نعتیہ شعر جو آج بھی زبان زد عام ہے ان کا ہے:

محمدؐ کا جہاں پر آستاں ہے
زمیں کی اتنا ٹکڑا آسماں ہے

ذیل میں ضرب المثل بن جانے والے مصرعوں کو مکمل اشعار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا
(آتش)

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
(اختر انصاری)

اب اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں
(شعیب بن عزیز)

ٹوٹا نہیں اشکوں سے ابھی ضبط کا پشتہ
پانی ابھی خطرے کے نشاں تک نہیں آیا
(یزدانی جالندھری)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
(اکبر الٰہ آبادی)

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
(صفی لکھنوی)

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
(غالب)

نیرنگی سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے
(محسن بھوپالی)

عید کا دن ہے گلے۔ آج تو مل لے ظالم
رسم دُنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے
(قمر بدایونی)

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
(قائم چاند پوری)

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے
(غالب)

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی
(کیف ٹونکی)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطان پوری)

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھُلا
(غالب)

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا
(مومن)

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
(علامہ اقبال)

پھرتے ہیں میؔر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
(میر تقی میر)

لائے ہیں اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
(پنڈت دیا شنکر نسیم)

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو
(ابراہیم ذوق)

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہ ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا
(مصحفی)

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا
(فانی بدایونی)

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں
(غالب)

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے
(مہتاب رائے تاباں)

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے
(حسرت موہانی)

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے
(ابراہیم ذوق)

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ
(داغ)

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ بند قبا دیکھ
(شیفتہ)

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی
(میر وزیر علی صبا)

عقل آرائی، تدبیر، سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
(ارشاد لکھنوی)

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
(مصطفٰی علی خاں شیفتہ)

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(علامہ اقبال)

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے
(اکبر الہ آبادی)

شکست و فتح نصیبوں سے تھی ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا
(میر تقی میر)

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
(آتش)

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کے ترے کوچے سے ہم نکلے
(غالب)

بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
(الطاف حسین حالی)

اور ہوں گے تری محفل سے نکلنے والے
حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
(داغ دہلوی)

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
(خالد شریف)

دُنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا
(قتیل شفائی)

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
(خواجہ میر درد)

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
(حفیظ جونپوری)

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
(میر انیس)

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
(ثاقب لکھنوی)

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
(عظیم دہلوی)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
(غالب)

داورِ حشر میرا نامہ اعمال نہ کھول
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آگے ہیں
(تاثیر)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(غالب)

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل
(سید محمد خان رند)

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا
(جگر مراد آبادی)

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
(میر انیس)

تعلیم الاسلام کالج قادیان کے حالیہ مناظر

تعلیم الاسلام کالج قادیان کے حالیہ مناظر

From Al Manar, June-July 1956

UNIVERSAL CONCEPTION OF HUMAN RIGHTS

Prof. Ch. Muhammad Ali, M.A.
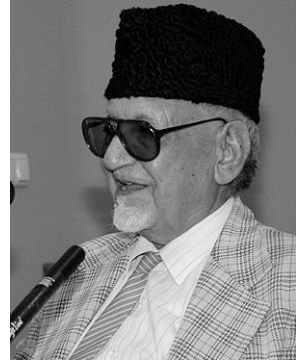
(A lecture delivered by Prof. Ch. Muhammad Ali, M.A., at the Symposium of the First Session of the Philosophical Congress, held at Lahore under the auspices of Punjab University)

The problem of human rights is bound up with the relative status of the individual and authority, particularly the authority of the State. Since the time of the ancient Greeks, there has been an age-long battle between those who prize individual freedom and those who value authority. It will take too long to give even a brief survey of the different theories that have been advanced from time to time with a view to defining the degree of control that the State or the group can legitimately exercise over the individual. It is difficult to dichotomize these theories mutually exclusive classes, but on the whole we may say that there are two main points of view basic to the great mass of recent writings which deal with this problem.

On the one hand, there are thinkers like Plato and Nietzsche and a host of their followers, who support the view that inequality is the natural state of man, and society is the supreme regimented hierarchy of the individuals. Consequently, each member of the State must take his proper place in the social structure. 'The Philosopher King' and the 'Superman' have the natural right to dictate, and the subjects have no right to question the decisions of their superiors. They must rest content with playing a secondary role in the tightly organized system. Hegel, Marx and others carried this view-point to its logical conclusion and held that certain groups or States were by nature superior to others and had the absolute right to rule. This, of course, is the distinct characteristic of all totalitarian systems.

Opposed to this entire trend is the democratic tradition, the main exponents of which are men like Locke, Rousseau and their followers. They emphasize individual freedom and private enterprise.

Both these standpoints are two extremes. To my mind, the most acceptable is the Islamic point of view which avoids both the extremes and tries to affect a synthesis of the two but without their defects.

Islam recognizes that society is a realm of ends; ends being the individuals. Unlike Hegelian idealism, it does not hold that society or State is an end in itself, and that the individual exists for the sake of society. Instead, it believes that the individual is an end in himself and the State is the means to this end. The State can and should exercise only that degree of control over the individual which is the minimum necessary for purposes of national security, international peace and the dispensation of public justice. Beyond that the State has no right to trespass over the freedom of the individual. The State exists for the individual and not the individual for the State. Therefore, Islam tolerates no regimentation of thought. The Holy Quran declares in the most unambiguous terms.

لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ

"There is no compulsion in religion." (2: 257)

وَقُلِ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ

"Tell them, this is the truth from your Lord; whosoever wishes, he may believe; and whosoever wishes, may disbelieve. " (18: 30)

لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ

"You are not placed over them as a task master." (88: 23)

And apart from the freedom of thought it also guarantees the freedom of expression. The Holy Quran says:

وَمَا عَلَيۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ

"Our duty is merely to convey the Truth." (36: 18)

It is hardly necessary to comment on this charter of human freedom. It guarantees complete freedom of thought and expression to the individual. It leaves no room for a professional priestly class or an official church. Each individual is responsible for his actions, and he alone is the sole judge in matters of conscience and belief. No one, not even the head of the State, has the right to force the humblest of citizens into or out of what he believes to be true or false. The individual is free to choose and to declare his belief. True, there has emerged at different occasions, a class of people who

have arrogated to themselves the right to judge for others, and have paraded as the custodians of public morals and the keepers of social conscience. But such people have never had the sanction of the Islamic Law at their back. The incalculable harm this class has done to the cause of Islam and individual freedom is a matter of history. The current misconceptions about Islam, particular1y in the West, are mainly due to these people. It is even said that Islam was spread by force and that Islamic Law allows apostates to be put to death. Nothing could be farther from the truth. Islam is the religion of freedom, freedom of thought, freedom of expression and freedom of belief and conscience. It recognizes no external authority, not even the authority of the State in matters of religion and conscience. The only authority it recognizes is the authority of reason which implies the absence of fear and coercion, and signifies the fullest expression of the human self and is to be distinguished from the narrower Kantian sense.

The Holy Quran clearly says:

لِيَهْلَكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ ۢبَيِّنَةٍ۔

"So that he may perish whosoever perishes on the basis of evidence, and he may live whosoever lives on the basis of evidence." (8: 43)

It might, however, be asked that as Islam is a religion, it cannot with consistency afford to demolish authority, particularly divine authority. Divine authority is, in fact, the end-all and be-all of all religions. The revealed word is a categorical imperative and is absolutely binding as being true, regardless of the qualms of conscience or rational doubt it may occasion in the mind of the believers. It is pointed out that religion means faith, and that faith is something which does not admit of rational measurement and judgment, that religious experience is a direct and immediate experience which is accepted by its recipient, and through him by his followers as an unchallengeable truth, and that all along religion is an *argumentum* and *verecundiam* except that the authority it invokes is very remote and has come to have a halo of mystery and tradition which invests the experience and its origin with a kind of reality. It is also pointed out that religious values are not demonstrable and inductive values.

This, however, is based on misconception. It is unfortunate that the Islamic view regarding truth and its acceptance as such is not yet generally accessible. It may, however, be noted that religious experience, in order to be accepted as true, must needs satisfy the known and established canons of scientific induction. It must be considered at par with ordinary human experience and should admit of being stated in empirical terms. The fact that it is highly subjective does not make it any the less susceptible to scientific treatment. Experience as long as it is experience cannot get out of the quagmire of subjectivity. In fact, experience always presupposes a subject. Berkley and Hume's subjectivism is not wholly an extremist point of view. Even Kantian distinction between phenomena and noumena rests on the same foundation. Descartes' *Cogito ergo sum* shows that the major premise of the system he tried to raise, consists of the Cogito or the subject. Even Russell with all his talk about truth as a neutral stuff cannot help calling it a subjective-objective monism. Hence religious experience does not suffer in truth by being subjective. But if it is to be accepted as being true, it should be capable of being judged by the general mass of mankind to whom it addresses itself. Truth values cannot be proved or disproved by *a priori* methods alone. All generalizations involving such values must fulfill the basic conditions of scientific induction. It is on the basis of this demonstrable, verifiable, and inductive proof that the claims of a prophet or, for that matter, of any true experience, should be based and accepted as being valid by the rational consciousness of man. Religious experience may be different from ordinary experience, but by virtue of this difference it does not cease to be an experience. The belief in a transcendental reality and the revealed word is not based on any magical and compulsive regard for the unknown or the mysterious. Instead, it is based on the firm bedrock of reason, experience, self-consistency and induction, and is finally demonstrable and verifiable. Even to the man who cannot immediately enter into this experience, the testimony of those, who can so enter, is not against the fundamentals of reason and should not be confused with authority. Testimony is not authority. It is second hand observation. It is based on a scrupulous regard for truth and does not exclude the possibility and right of direct experience. It is employed by all sciences and is accepted as reliable as direct observation. Therefore, faith or belief in the revealed word is not uninductive. We believe in it as we believe in the observation and testimony of any reliable scientific observer. In a testimony of this kind, or for that matter in all scientific induction, the appeal is to facts. Once we are sure of the ground of our generalization, and it is found

to be guaranteed by facts, we can go ahead with confidence from the known to the unknown, from some to all.

This predictive risk, this faith in the inductive method, this scrupulous regard for truth is what constitutes the quintessence of modern scientific generalization. No blind faith or mere dictation, but faith founded on facts.

Truth, in order to be true, must be found to be so and must be amenable to standard scientific tests and scrutiny. Influences that are likely to prejudice or otherwise vitiate our judgment are denounced by Islam. Shirk, or regard for the false gods of custom, habit, wealth, power, etc., is the greatest sin in Islam. Hypocrisy or *Munafiqat* or dishonesty of thought, committed through conscious choice, is the next worse. And the most cardinal value is to deny all gods except God, the custodian of Truth, Justice and Fairplay, and to accept His Prophet as His humble servant, and a Messenger without conferring any supernatural status on him.

إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ...

"I am but a man like unto you: (but it is only that) God has revealed to me......" (18: 111)

It is in this context that the Holy Quran again and again exhorts us to think and ponder, judge and measure the message and the Messenger, and to subject them to the closest and the most critical scrutiny, even though the facts on which the message is based are definite, clear and incontrovertible. Says the Holy Quran: -

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔

"That they may think." (7: 177)

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِم مِّن جِنَّةٍ۔

"Do they not reflect; their companion is not of the insane?" (7: 185)

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ۔

"Are the blind and the seeing alike? Do you not then ponder?" (6: 51)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔

"Surely there are signs in this for a people who reflect." (13: 4)

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔

"Thus do we enumerate and explain in signs for a people who reflect." (10: 25)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔

"Surely there are signs (in nature) for a people who reflect." (16:12)

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔

"Thus does Allah make plain to you His signs that you may think." (2: 220)

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ۔

"Certainly, we have explained to you the signs only if you understand." (3: 119)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔

"So that you may understand." (2: 74)

أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔

"Have you then, no intelligence?" (2: 45)

أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ۔

Are you not, therefore, fully reminded? (6: 81)

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

"Why not a party from each comes forward to acquire an understanding of the faith?" (9: 123)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ۔

"Will they not then meditate on the Quran?" (4: 83)

لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ۔

"That they may ponder over its verses." (38 -30).

Thus it sets up reason and rational methods as the sole criterion of truth. It does not allow the use of force to stifle thought, for force may silence but cannot convince. As a matter of fact, it cannot even silence. That is why the Holy Prophet Muhammad (on whom be peace) said that honest difference of opinion is a blessing. A society or a State, which does not tolerate difference of opinion or denies even the right to beg to differ, cannot with consistency attach value to truth, honest thinking and freedom of judgment. Coercion breeds distrust and hypocrisy. It also betrays a serious lack of proof and argument. That is why the Holy Quran declares:

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔

"There is no coercion in Islam." (2: 257)

It, therefore, leaves no room for the regimentation of thought and purpose brought about under duress. It is in this context that the place of the moral reformer is to be considered. He raises his voice against the established order through constitutional means. He is allowed perfect liberty to Judge the current values that obtain in a particular society, He is further allowed to express his judgments and opinions publicly. In other words, not only is he allowed to think but to think aloud. In this sense he is a true revolutionary. And the

revolution he tries to bring about is the bloodless and the peaceful revolution in the realm of ideas and values. But he is not an anarchist; nor is he a frustrated maniac. His methods are not self-contradictory; he does not preach freedom and practice force and coercion to impose his views on others. Reason and proof are the only weapons in his armory.

He appeals directly to the consciousness of the individual. His duty is merely to convey his message.

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

"And our duty is only to convey the message of Truth." (36: 18)

It is for each individual separately to believe or not to believe, accept or not to accept. It is none of his business to force people to believe as he does and compel them to conform to his views. The Holy Quran emphatically declares:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔

"Tell (them), this is the Truth from your God. If you like, accept it, if you like, reject it." (18-30)

And if people do not accept his message he is not held responsible for what they choose to do. For similar reasons, Islam does not allow the individual the right to physical revolt against the society whose member he happens to be. This is to emphasize the need and role of freedom in matters of be1ief and conscience, and to insulate the social structure against disruption and anarchy. It, however, grants to the individual the right to disagree and express that disagreement publicly. But he has no right to revolt and use force to prove the bonafides of his case, or to counter the force of social opi-nion by rising in armed rebellion. It distinguishes between reform and revolt, change and destruction. It believes in change and reform through peaceful, just and fair methods.

If society does not give to the individual the right to reform and disagree, that is, if it does not give him the right and chance to think and act honestly, and forces him to forsake his views under threat of pain, then Islam recognizes the individual's right to leave that society and migrate to some other place, where he can hold views consistent with the verdict of his reason and conscience and can suit his actions to his beliefs. But it does not allow him to retaliate in kind. Thus, except for defense, Islam banishes the use of swords, and encourages the freedom of thought and expression. That is why the Holy Prophet (on whom be peace) encouraged the spirit of inquiry and scientific outlook placing a premium on the Socratic maxim, that knowledge is virtue, and advised the Muslims to acquire knowledge even if they had to go to China. Islam thus demolishes all barriers to free thought. Kant very nearly summed up the Islamic position when he pointed to "the starry heavens above and the moral law within." Thus to my mind, what may be called the quintessence of Islam, is the twin principia of the Divine Law and the right of the individual to judge and accept or reject that law in the light of the verdict of his own reason and conscience. The false gods or what Bacon calls the idols of the tribe, market and theatre are once and for all dethroned and removed from their pedestals and leveled to the ground. Be it a State or a superman, the proletariat or a majority party, power or wealth, Church or custom, none has the authority though it may sometimes conspire to have the power, to dictate and suppress freedom.

On the other hand, while Islam safeguards the freedom of the individual, it also recognizes the negative possibilities of what Plato would call the mob rule. In the words of Russell, "A society, where each is the slave of all, is only a little better than one, where each is the slave of a despot." Individual freedom in democracy is only skin deep. It is more apparent than real. The so-called freedom of individual enterprise results in rank social and economic injustice. The capitalist class holds the reins of power, wealth and propaganda. True, it allows opposition to government policies and freedom of belief and propaganda, which is not allowed under totalitarian systems, and is, therefore, to be preferred to them to that extent. But even under democracy opinion is too highly organized to allow any scope for free and independent thinking. The independent member of the house is a solitary and an amusing figure, which has no authority and a doubtful future unless he gives up his independence and decides to merge with some party. In fact, communism is the direct result of the economic and social injustices that have been committed in the name of democracy. The choice, therefore, has to be made between Marxism and Democracy, police rule and mob rule, regimentation and license. These may be catch-phrases but they do bring out the inherent defects of either side. Islam tries to avoid these extremes and tries to follow the middle course. Like Plato it does not foist a superior intellectual aristocracy denying the workers and women even the right to think

for themselves. Nor does it impose an absolute autocrat, whose will is law and who is responsible to none except himself as is done by Nietzsche and others. It does not set up a "classless class" of a ruling hierarchy which considers the freedom of the individual a dangerous tendency and a bourgeois illusion, and thinks of religion as the opium of the masses denying even the right to think otherwise.

In Islam the Caliph or the head of the State is a Constitutional Head with a Divine Law and Constitution that is, the Holy Quran. He is duly elected and is not above this Law and Constitution, which he is bound to obey most scrupulously in all its details and which he himself has accepted on the basis of reason. He cannot cancel or modify any part of the law. He is, however, not bound to submit to the dictation of mere numbers or a blind majority. Within the Law, he can exercise his discretion to save a Socrates or a Christ from the fury of the mob. But he does not and has no right to violate or flout the Divine Law and Constitution. It is his duty to see that the vested interests do not make it difficult for the humblest of citizens to think freely. It is clearly laid down that he must invariably seek advice. The Holy Quran says:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۔

"Seek counsel from them in the affairs." (3: 160)

Again, it says:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔

"They take decisions after mutual consultation." (42: 39)

Thus it is necessary that no taboo is placed on offering free advice. Conditions should be created which are conducive to the free exercise of the right to vote. The Holy Quran makes it a condition precedent to the right to vote, that the vote must go to the deserving person. It says:

اِنَّ اللهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۔

"Surely, Allah commands you to make over trusts to the deserving of it." (4: 59)

In the Islamic State none is too humble and unworthy to offer advice and none is too great and perfect to receive it. The only condition is that advice must be positive and constructive, honest, just and fair and must not militate against the legitimate rights of other individuals.

The Holy Quran says:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْ

"And when you speak, be just." (6: 153)

As a further precaution against injustice, the judiciary is guaranteed complete independence. Even the Head of the State can be summoned to a judicial court as an ordinary citizen. No considerations of fear or favor should weigh with the court, and it must not allow its impartiality to be corrupted at any cost. It further refuses to accept any distinctions between man and man. Even the Holy Prophet (on whom be peace), who to the Muslims is the best and the greatest of human beings, is to be taken as a human being. The Holy Quran says:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ...

"(0 Prophet of God), tell them, I am a man like unto you except that I am the recipient of divine inspiration." (18: 111)

It is not possible to discuss here the detailed rules laid down by Islam to ensure justice and equity and abolish all economic, social, cultural and intellectual exploitation of man and woman alike. While it tries to draw the line between freedom and license, it clearly defines the rights and duties of the State and the individual. It prescribes effective safeguards at the individual, national and international levels against all kinds of aggression, and tries to stop the vested interests from making inroads against the rights of the individual. It raises the individual from a mere means to the exalted position of an end, from a biological specimen to a human being, the best of God's creation and offers limitless possibilities for the realization of the best in him.

It is to be hoped that after having suffered tremendous losses in men and material, human dignity and moral worth, man may yet save himself and rediscover Islam. I cannot help quoting here the concluding passage of Bertrand Russell's book 'Religion and Science', in which he says:

"Those to whom intellectual freedom is personally important may be a minority in the community. But among them are the men of most importance to the future ....If they are prevented from doing their work and having their due effect, the human race will stagnate, and a new Dark Age will succeed, as the earlier Dark Age succeeded the brilliant period of antiquity. New truth is often uncomfortable, especially to the holders of power; nevertheless, amid the long record of cruelty and bigotry, it is the most important achievement of our intelligent but wayward species.

BULLEH SHAH (1680-1758) LEADING LIGHT OF PUNJAB

By Safir Rammah

Bulleh Shah (1680-1758) and Mir Taqi Mir (1723-1810) shared the same time and space - eighteenth century Northern India - and were amongst the major poets of their respective languages. They had both lived during the time just before the proliferation of the printing press, state-sponsored educational institutions and standardized textbooks. Today, it is hard to find an educated Pakistani with any level of interest in literature who doesn't have some appreciation of Mir Taqi Mir's poetry. It is equally hard to find someone in that privileged group who knows much about Bulleh Shah.

The literary fortunes of Mir Taqi Mir and Bulleh Shah symbolize the far-reaching consequences of the British Government's educational policies in Punjab where Urdu was chosen to become, and in Pakistan's Punjab of today still continues to be, the medium of instructions in government schools.

Mir Taqi Mir's poetry, riding the wave of mass literacy, not only became a household name among the Urdu speaking populace but also crossed the linguistic boundaries over to the Punjab. In this province too school and college students for the last 150 years have been learning to appreciate the exquisite compositions of his ghazals. Bulleh Shah's poetry, on the other hand, was almost forgotten. It was never introduced in the classrooms and hence missed the opportunity to reach and touch the minds and souls of generations of Punjab's educated elite.

Most of what we know about Bulleh Shah's life has come to us through unreliable anecdotes and folklore. The limited authentic historical record, based on sporadic references to events of his life in his poetry and in the writings of his contemporaries, is barely enough for a brief sketch of his life.

He belonged to a Syed family and was born in 1680 in a small village, Uch Gilania, in Bahawalpur. His father's name was Sain Mohammad Darvesh and his own real name was Abdullah. When he was six years old, his family moved to Kasur where he got his formal education from Maulvi Ghulam Murtaza, who was the Imam of the main mosque in Kasur.

For a while after completing his education, Bulleh Shah taught at the same mosque. He then became a murid of Inayat Shah Qadri, a famous saint of Qadirya school of Sufis in Lahore, who belonged to the Arain caste. Bulleh Shah had to face the resentment and taunts of his family and other Syed friends for accepting the spiritual guidance of a non-Syed. The poetic response from Bulleh Shah rejected his critics' false concept of inherent superiority and nobility of any caste and set the pattern of his lifelong challenge to accepted norms:

جیہڑا سانوں سیّد سدّے، دوزخ مِلن سزائیاں
جو کوئی سانوں رائیں آکھے، بھشتی پینگاں پائیاں
رائیں، سائیں سبھنی تھائیں، رب دیاں بے پروائیاں
سوہنیاں پرے ہٹائیاں، تے کوجھیاں لے گل لائیاں

Those who call me Syed
Are destined to hell made for them.
Those who call me Arain
Have the swings of heaven laid for them.
The low-caste and the high-caste,
Are created by God who is all-powerful;
He casts away the fair ones,
And clasps to His heart the meritless ones.

In 1729 when Shah Inayat died, Bulleh Shah succeeded him as the head of his monastery at Lahore. Bulleh Shah died in 1758. He never married.

Even with the recent upsurge in Bulleh Shah schol-

arship, credible critical works highlighting some of the most important aspects of his poetry are lacking. The initial research was focused on collecting, editing and authentication of the earlier written records and folk memory of his poetry. Critical appreciation of his poetry has not yet gone beyond expositions of its religious aspects.

Bulleh Shah's poetry can be divided into three broadly distinct periods reflecting the progression of his thoughts throughout his life.

In the first period, the love and devotion of his murshid is the main theme. A minor turbulence in this relationship would cause a great anguish for him and the poetry of this early period reflects the whole vista of emotions from unbearable pain and dejection to the extremes of delight and exuberance:

تیرے عشق نچائیاں کر کے تھیّا تھیّا
تیرے عشق نے ڈیرا، میرے اندر کیتا
بھر کے زہر دا پیالہ، میں تے آپے پیتا
جھب دے بوھڑیں وے طبیبا، نئیں تے میں مر گِئیا
تیرے عشق نچائیاں کر کے تھیّا تھیّا

Your love has made me dance to a fast beat!
Your love has taken abode within my heart!
This cup of poison I drank all by myself.
Come, come, O physician, or else I breathe my last!
Your love has made me dance to a fast beat!

In the second phase, poetic expressions of Bulleh Shah's mystic experience are prominent:

تُوں ہیوں ہیں میں ناہیں سجنا! تُوں ہیوں ہیں میں ناہیں سجنا
کھولے دے پر چھاویں وانگوں گھُوم رہیا من ماہیں
جے بولاں توں نالے بولیں، چُپ رھواں من ناہیں
جے سونواں تُوں نالے سونویں، جے ٹُراں تُوں راہیں
بُلھیا، شوہ گھر آیا میرے۔ جِندڑی گھول گھُمائیں
تُوں ہیوں ہیں میں ناہیں سجنا! تُوں ہیوں ہیں میں ناہیں سجنا

You alone exist; I do not, O Beloved!
You alone exist, I do not!
Like the shadow of a house in ruins,
I revolve in my own mind.
If I speak, you speak with me:
If I am silent, you are in my mind.
If I sleep, you sleep with me:
If I walk, you are along my path.
Oh Bulleh, the spouse has come to my house:
My life is a sacrifice unto Him.
You alone exist; I do not, O Beloved!

Most of Bulleh Shah's critics tend to focus on the first two phases of his poetry. Generally, the writings on Bulleh Shah are little more than explanations of the mystic content of his poetry in the context of different Sufi schools of thought. Some of his more enlightened, progressive and humanist compositions are said to be written under the influence of Bhagti ideas. His poetry is considered to be mainly concerned with the eternal life. This ignores the fact that the most significant part of Bulleh Shah's poetry is his fierce denunciation of all forms of oppression, especially the oppression of freedom of thought and other obstacles towards peaceful human coexistence.

It is this third phase of Bulleh Shah's poetry, apparently written after reaching the heights of his spiritual quest and gaining a unique wisdom and insight into human affairs, that has made him one of the most popular Punjabi poets.

He advocated the pre-eminence of truth, love, and compassion over religious scholarship, external formalities and blind faith. His outright rejection of any formal authority of religious institutions in regulating the affairs of society, in particular the role of the mullahs and religious scholars, became the subject of many of his famous poems. He sharply criticized the rigid beliefs and intolerance of mullahs and preachers that in his opinion were the main source of communal hatred.

مُلاں تے مشالچی، دونھاں اِکُو چِت
لوکاں کر دے چانناں، آپ انھیرے وِچ

The mullah and the torch-bearer
Hail from the same stock;
They give light to others,
And themselves are in the dark.

He believed that human beings equally deserve the right to live a life of peace and dignity regardless of their color, creed or status:

سب اِکُو رنگ کپاہیں دا
تانی، تانا، پیٹا، نلیاں

پیٹھ، نڑا، تے چھبّاں چھلیاں

آپو اپنے نام جتاون

وکھّو وکھّی جائیں دا

سب اِکّو رنگ کپاہیں دا

There is only one thread of all cotton.

The warp, the woof, the quill of the weaver's shuttle,

The shuttle, the texture of cloths, the cotton shoes and hanks of yarn,

All are known by their respective names,

And they all belong to their respective places

But there is only one thread of yarn.

Bulleh Shah never cared to mince words in his bold and courageous challenge to the forces of darkness of his time. He was a liberal and progressive thinker in the most modern sense. His outspoken and blunt style struck a chord with all segments of Punjabis who have kept his memory alive without the help of state institutions.

He was the leading light of a rich Sufi tradition of Punjabi poetry that for many centuries had spread the message of religious tolerance, communal harmony, liberalism, humanism and love. Set to the tunes of folk and classical music, compositions of Bulleh Shah and other Punjabi Sufi poets are remarkable pieces of literary art that synthesize highly complex ideas, emotions and experiences in the homely and deceptively simple idioms and metaphors of rural Punjab. The intention is not just to charm but also engage and enlighten the hearts and minds of the audience. By all critical accounts, the classical Punjabi Sufi poetry reached its pinnacle in Bulleh Shah.

Loved by Punjabis of all faiths and creeds, Bulleh Shah could have easily claimed the title of a national poet of all Punjabis if such a title was ever considered to be politically correct.

(Reprinted From The Dawn, September 22, 2002)
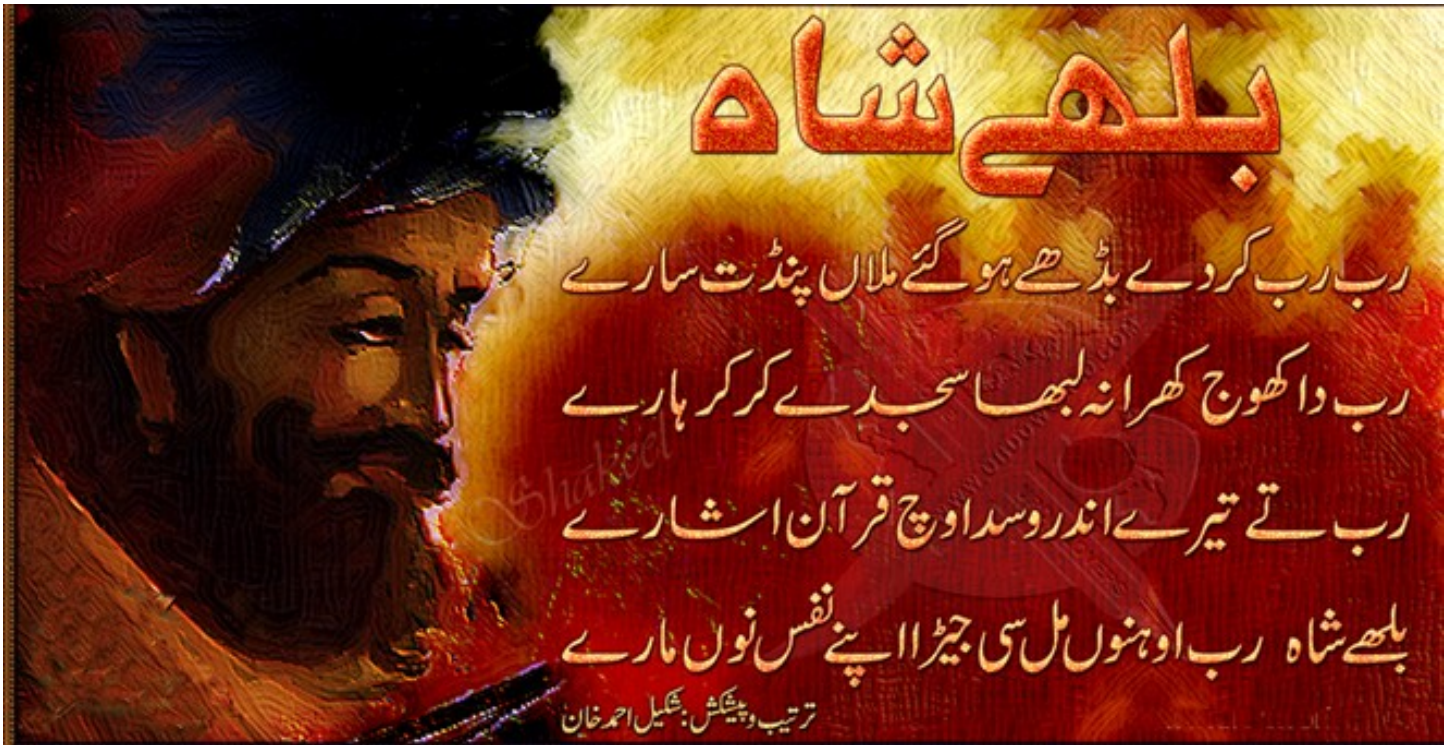
Quarterly

Vol 1, No 2, April—June 2013

ALMANAR

A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA